نیّر مسعود
به نام
رشید حسن خاں

ڈاکٹر ابراہیم افسر

نیّر مسعود بہ نام رشید حسن خاں ڈاکٹر ابراہیم افسر

نیّر مسعود

بہ نام

رشید حسن خاں

مرتّب

ابراہیم افسر

©جملہ حقوق بحق محفوظ!

Rasheed Hasan Khan

Edited by

Ibraheem Afsar

Ward No-1, Mehpa Chauraha Nagar,
Panchayat Siwal khas Distt, Meerut (U.P)250501
+ 91 9897012528, 8077319637
Email:ibraheem.siwal@gmail.com

Year of Edition: 2020
ISBN: 978-93-84271-37-4
(Deluxe Edition)
Price 600/-

نام کتاب : نیر مسعود بہ نام رشید حسن خاں
مرتب وناشر : ابراہیم افسر

سن اشاعت : ۲۰۲۰ء
قیمت : -/۶۰۰ روپے
تعداد : ۵۰۰
مطبع : ایچ.ایس.آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

NEW BISMAH KITAB GHAR
Distributor:
Kitabi Duniya
1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Opp. Anglo Arabic School, Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
M: 9313972589, 8826741174, 8929421423 Ph: 011-23288452
E-mail:kitabiduniya@rediffmail.com
kitabiduniya@gmail.com

Mir Zaheer Abass Rustmani
03072128068

انتساب

محترم شمس الرحمٰن فاروقی کے نام

جن کی وجہ سے

نیّر مسعود کی ملاقات رشید حسن خاں سے ہوئی

فہرست

☆☆☆

مقدمہ

پروفیسر نیر مسعود (1936-2017)، رشید حسن خاں (1925-2006) کو اُس زمانے سے جانتے تھے جب وہ اختر تلہری کے ساتھ ان کے والد محترم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب سے ملاقات کے لیے ان کے گھر لکھنؤ آتے تھے۔ ان دونوں مایہ ناز ادیبوں کے درمیان خط و کتابت کا طویل سلسلہ تاحیات چلتا رہا۔ رشید حسن خاں کو اگر لکھنوی تہذیب، معاشرت یا لکھنؤ کے کلاسیکل ادب پر کوئی بات معلوم کرنا ہوتی تو وہ براہ راست پروفیسر نیر مسعود کو خط تحریر کر کے اپنا مدعا بیان کرتے۔ یہ دونوں مایہ ناز ادیب ایک دوسرے کے معاصرین ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے ادبی رفیق بھی تھے۔ ایک دوسرے کی ادبی تحریروں پر گفت و شنید کرنا ان کا ادبی فرض تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ایسی ادبی بات جو ایک دوسرے کے نظریات کو متاثر کرتی تو فوراً اس پر اعتراض درج کیا جاتا۔ حالاں کہ ان ادبی باتوں میں کچھ باتیں زبانی ہوتی اور کچھ تحریری شکل میں۔ پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں دونوں ہی مشرقی علوم کے ماہر اور تحقیق کے جویا تھے۔ لیکن پروفیسر نیر مسعود محقق کے علاوہ مترجم، فکشن، نگار، فکشن ناقد اور لکھنوی تہذیب کے دلدادہ کے ساتھ علم بردار بھی تھے۔ لکھنوی تہذیب، تمدن و ثقافت ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھی۔ جب تک پروفیسر نیر مسعود باحیات قید رہے وہ لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت کے پرستار رہے۔ انھوں نے اس تہذیب کو اپنے افسانوں میں اس طرح بیاں کہ لوگوں کی زبان پر ایک بار پھر اس مٹتی اور گُم ہوتی ہوئی تہذیب کے چرچے ہونے لگے۔ ان کا شاہ کار افسانہ ''طاؤس چمن کی مینا'' لکھنوی تہذیب و ثقافت کا لازوال نمونہ اور مرقع ہے۔ اس افسانے کی قرأت کرتے وقت قاری اُس دور میں پہنچ جاتا ہے جہاں چاروں طرف اس تہذیب کے نقوش موجود تھے۔ افسانے کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ قاری کے دل و دماغ پر صرف اور صرف لکھنوی رنگ کا سرور چڑھنے لگتا ہے اور اسے لکھنؤ کے آخری تاج دار واجد علی شاہ کا زمانہ پروفیسر نیر مسعود کے افسانے میں نظر آنے لگتا ہے۔

پروفیسر نیر مسعود، رشید حسن خاں کے علم، اکتساب اور اکتشاف کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کے تحقیقی، تنقیدی اور تدوینی کارناموں پر جہاں ایک جانب انھیں رشک ہوتا تھا وہیں دوسری جانب انھیں ان کے کارہائے نمایاں پر خط لکھ کر مبارک باد پیش کرتے تھے۔ 1978 تک پروفیسر نیر مسعود کی رشید حسن خاں سے کوئی خاص رسم و راہ نہیں تھی۔ جب کہ رشید حسن خاں ان کے والدِ محترم کے پاس اکثر آتے جاتے تھے، وہ نیر مسعود کے نام اور کام دونوں سے واقف تھے۔ البتہ 1975 میں جب پروفیسر نیر مسعود کے والدِ محترم پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کا انتقال ہوا تو رشید حسن خاں نے نیر مسعود کے نام ایک تعزیتی خط تحریر کیا تھا۔ اس کے دو سال بعد جب رشید حسن خاں لکھنؤ کسی کام سے آئے تو تعزیت کے لیے ادبستان کا رُخ کیا، لیکن اتفاق سے پروفیسر نیر مسعود گھر پر موجود نہیں تھے۔ پروفیسر نیر مسعود کو اس بات کا قلق رہا کہ ان کی ملاقات رشید حسن خاں سے نہ ہو سکی۔ 1980 کی گرمیوں میں پروفیسر نیر مسعود نے شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ دہلی میں رشید حسن خاں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ اپنے دہلی آنے کی اطلاع کے لیے انھوں نے خاں صاحب کو ایک خط بھی لکھا۔ جب پروفیسر نیر مسعود، شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال میں ان کے کمرے پر پہنچے تو دیکھا کہ آنکھوں پر چشمہ لگائے ایک شخص علمی و ادبی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہے۔ پروفیسر نیر مسعود کو رشید حسن خاں اب تک شکل و صورت سے پہچانتے نہیں تھے۔ لیکن جب شمس الرحمٰن فاروقی نے رشید حسن خاں سے ان کا تعارف کرایا اور کہا کہ 'یہ نیر مسعود ہیں اور لکھنؤ سے صرف آپ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں' تو خاں صاحب نے خوشی کا اظہار کیا۔ پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد رسالہ اظہار ممبئی کے لیے مضمون ''رشید حسن خاں کی تنقیدی تحریریں'' سپردِ قلم کیا۔ اس مضمون میں پروفیسر نیر مسعود نے

رشید حسن خاں کی تنقیدی اور تحقیقی فتوحات کا عالمانہ اور ناقدانہ تجزیہ پیش کیا۔ اس مضمون کی ابتدا نیر صاحب نے رشید حسن خاں کے 1970 میں شائع ہوئے مضمون ''دہرے کردار کی پرچھائیں'' (سطور، دہلی) کے اُس اقتباس سے کی جس میں خاں صاحب نے اُردو تنقید کے انشائیہ اسلوب کی پُر فریبی کا محاکمہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے خاں صاحب کے پہلے مضمون 'شبلی کا فارسی تغزل'، 'دستِ صبا پر ایک نظر'، 'فیض اور اس کی شاعری'، 'تنقیدی جانب داری کے اسباب اور اثرات'، 'زبان و بیان کے بعض پہلو'، 'غزل اور ترقی پسندی'، 'دیوانِ خاقانی'، 'ثقافتِ پاکستان'، 'علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'، 'اُردو شاعری کا انتخاب'، 'غالب صدی اڈیشن مرتبہ مالک رام'، 'تاریخ ادب اُردو از جمیل جالبی' وغیرہ کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا۔ مضمون کے آخر میں پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی علم پروری، وسعت مطالعہ، بالغ النظری، اُردو ادب کی تاریخ پر عمیق نگاہ رکھنے اور عربی و فارسی زبانوں سے واقفیت کے سبب زبان و بیان کے مسائل کو تحقیقی اور سائنٹفک انداز سے پیش کرنے والا محقق گردانا۔ اس زمانے میں رشید حسن خاں کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں، جن میں اُردو املا، زبان و قواعد، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ اہمیت کی حامل تھیں۔ نیر مسعود نے انھیں فسانۂ عجائب کے متن کی تکمیل احسن طریقے سے کرنے کی پیشگی مبارک باد دی۔ نیر مسعود کے اس اہم مضمون کا آخری اقتباس ملاحظہ کیجیے اور رشید حسن خاں کی احتسابی تحقیق و تنقید کے معیار پر غور و خوض کیجیے:

> ''تحقیق کی تنقید ادب، خصوصاً کلاسیکی ادب کی تاریخ اور متن دونوں کو بہت وسیع اور ذمہ دارانہ مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ عروض، قواعد اور املا کے مسائل اور فارسی زبان و ادب پر بھی گہری نظر اور تحقیق کے ناقد کے لیے ضروری ہے۔ یعنی اس کے لیے بھی وہ سب شرطیں لازم ہیں جو اچھے محقق کے لیے لازم ہیں۔ رشید حسن خاں ان سب شرطوں کو بہ خوبی پورا کرتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''اُردو املا'' اور ''زبان و قواعد'' کی اشاعت کے بعد انھیں املا اور زبان کے مسائل پر سند کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان کا ایک اور بہت اہم کارنامہ (جو غالباً اسی سال منظرِ عام پر آ جائے گا) ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین ہے۔ اس مضمون کو رشید حسن خاں کی صرف تنقیدی تحریروں تک محدود رکھا گیا ہے۔ اس لیے ان کتابوں پر گفتگو کا یہاں محل نہیں ہے۔ ان کا حوالہ صرف یہ جتانے کے لیے دیا گیا ہے کہ رشید حسن خاں کو اُردو تحقیق میں جن معیار کی طلب ہے اس کا نمونہ وہ خود پیش کرنے پر قادر ہیں۔ اس لیے ان کی اپنی تنقیدوں میں اعتراض اور احتساب کا حق دوسروں سے زیادہ حاصل ہے۔ ان کی اس احتسابی تنقیدوں کو منفی رجحان کا نام دے کر سبک کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ اوّل تو منفی رجحان کا غیر مفید ہونا ہی محل نظر ہے دوسرے...... تخلیق کے احتساب اور تحقیق کے احتساب میں فرق بھی بہت ہے تخلیق کا سخت ترین احتسابی ناقد خود وقت ہے جو غیر معیاری تخلیقات کو بحث و دلیل کے بغیر محو کر دیتا ہے لیکن تحقیق کے مسامحات کی اگر گرفت نہ کی جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مسامحات کو ہمیشہ کے لیے مسلمات کی حیثیت حاصل ہو جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ان مفروضہ مسلمات کی بنیاد پر آیندہ تحقیق کی جو عمارتیں بلند ہوسکتی ہیں ان کو تعمیر کے ابتدائی مرحلوں ہی میں منہدم کر دینا کارِ خیر ہے۔ رشید حسن خاں کی تنقیدوں نے یہی کارِ خیر انجام دیا ہے۔''

(اظہار/5، ممبئی 1984، باقر مہدی، صفحہ 92)

1980 کے بعد پروفیسر نیر مسعود اور خاں صاحب کی قربتیں اور بڑھنے لگیں۔ لکھنؤ میں جب بھی رشید حسن خاں اُردو اکادمی کے ممبر کی حیثیت سے تشریف لے جاتے تو نیر مسعود کے گھر ضرور جاتے۔ گھر پر دنیا جہان کی باتیں ہوتیں وہیں دونوں کے درمیان ادبی تبادلۂ خیال بھی ہوتا۔ یہاں تک کہ رشید حسن خاں اپنے صاف اور دوٹوک لہجے سے وہ باتیں کہہ جاتے جن سے پروفیسر نیر مسعود احتراز کرتے۔ لیکن نیر مسعود، خاں صاحب کی کھری کھری باتوں کے نہ صرف قائل تھے بلکہ معترف بھی تھے۔ پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی سخت گیری اور دوٹوک انداز کا ایک واقعہ نقل کیا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ جب اُتر پردیش اُردو اکادمی کی جنرل کونسل کے رُکن کی حیثیت سے وہ لکھنؤ آئے تو ان کے سامنے کونسل کے ہی ایک رُکن نے اپنی کتاب پیش کی تو خاں صاحب نے کتاب کا انتساب پڑھتے ہی اپنا قلم نکال کر لکھا ''خدا غلام بنائے، غلام صورت نہ بنائے۔'' مصنف نے اس فوری ردِعمل کو پڑھ لیا۔ نیر صاحب نے خاں صاحب سے کہا کہ آپ نے غضب کر دیا، انھوں نے پڑھ لیا'' اپنی مسکراہٹ کے ساتھ خاں صاحب مخاطب ہو کر بولے کہ یہی تو میں چاہتا تھا۔ اس کے بعد اکادمی کے اجلاس میں خاں صاحب نے زوردار تقریر کی۔ اس تقریر میں رشید حسن خاں نے نام نہاد ادبی لوگوں کو ''حرام زدگانِ ادب'' کے خطاب سے نوازا۔ اس واقعے کا میں مکمل اقتباس نقل کرتا ہوں تاکہ قارئین خود اندازہ لگا سکیں کہ نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی اس حرکت و عمل کو کن خوب صورت الفاظ کے سہارے بیان کیا ہے:

> ''اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی جنرل کونسل میں نامزدگی اور اکاڈمی کی کچھ سب کمیٹیوں کی رکنیت کے بعد سے رشید حسن خاں کی لکھنؤ آنے کا اکثر موقع ملتا ہے۔ جنرل کونسل کے اجلاس (اپریل 1981) میں ان کی شرکت کا خاصا چرچا تھا اور توقع تھی کہ وہ اجلاس میں بھی سخت گیر نقاد کے فرائض بحسنِ وجوہ انجام دیں گے اور انھوں نے حسبِ توفیق اس توقع کو پورا بھی کیا۔ اسی اجلاس میں کونسل کے ایک رُکن نے خاں صاحب کو اپنی تازہ تصنیف پیش کی۔ جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ان کی نظر انتساب کے صفحہ پر پڑ گئی۔ کتاب اُردو کے ایک نقاد کے نام معنون تھی جو خاں صاحب کے معیارِ حسن پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ انھوں نے فوراً قلم نکال کر نقاد کے نام پر خط کھینچا۔ لکھا، ''خدا غلام بنائے، غلام صورت نہ بنائے۔'' اور کتاب میری طرف بڑھا دی۔ مصنفِ کتاب میری برابر والی کرسی پر بیٹھے تھے اور اگر چہ میں نے کتاب فوراً بند کر دی لیکن تاثراتی تنقید کے

اس قولِ فیصل پر ان کی نظر پڑ ہی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے خاں صاحب سے سرگوشی میں کہا: ''آپ نے غضب کر دیا، انھوں نے پڑھ لیا۔'' ''یہی تو میں چاہتا تھا۔'' خاں صاحب نے بڑی آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے سرگوشی میں دورِ حاضر کے ادبی کاروبار پر ایک ہوش افزا اور ہوش ربا تقریر کی اور الحمدللہ کہ جوش میں آنے کے باوجود ان کی آواز بلند نہیں ہونے پائی اور مجمعِ سامعین کے فرائض میں تنہا انجام دیتا رہا۔ رشید حسن خاں کی احتسابی تنقید میں جو التہاب و اشتعال نظر آتا ہے وہ دراصل اسی تقریر کے چند نسبتاً کمزور اور دوستانہ فقروں کی بدولت ہے۔ تقریر میں انھوں نے نام بہ نام کئی مشاہیرِ ادب کے کارنامے بیان کیے جنھیں سن کر حیرت ہوئی کہ اپنی خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔ یہ رشید حسن خاں کی محبوب تقریر ہے جو صرف بے تکلف صحبتوں کے لیے مخصوص ہے۔ تقریر میں ان مشاہیر کا تذکرہ تمام کرنے کے بعد وہ اپنی تحقیق و تنقید کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں: ''میں ان سب کو حرام زدگانِ ادب کہتا ہوں۔'' اور سننے والوں کو بھی ان غریبوں کی ولدیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔''

رشید حسن خاں کی مرتب کردہ شاہ کار کتاب ''فسانۂ عجائب'' جب 1990 میں منظرِ عام پر آئی تو ادبی حلقوں میں اس کتاب کے متن اور مقدمہ کے تعلق سے بہت سی باتیں سامنے آئیں۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے تو باقاعدہ رشید حسن خاں کی علمی لیاقت اور تحقیق دونوں پر سوالیہ نشان قائم کرتے ہوئے رسالہ آج کل نئی دہلی، نومبر 1993 میں ایک مضمون ''فسانۂ عجائب پر ایک نظر'' تحریر کیا۔ اپنے مضمون کے آخر میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے لفظوں کا گوشوارہ بنایا جس میں انھوں نے رجب علی بیگ سرور کے اصل متن اور رشید حسن خاں کے مرتب کردہ متن کے لفظوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا۔ لیکن پروفیسر نیر مسعود نے 7 جون 1990 کو لکھنؤ دوردرشن پر کاظم علی خاں کے ساتھ ایک ادبی مذاکرے میں رشید حسن خاں کی مرتب کردہ کتاب 'فسانۂ عجائب' پر تبادلۂ خیال پیش کرتے ہوئے اس کتاب کی ادبی و لسانی اہمیت، معنویت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ''متن کا جہاں تک تعلق ہے میرا خیال ہے ہم سب اس پر متفق ہیں کہ اُردو نثر کی کوئی کتاب ابھی تک اتنے اہتمام کے ساتھ ایڈٹ نہیں کی گئی تھی۔'' دراصل رشید حسن خاں جب اس کتاب کو مرتب کر رہے تھے تو باضابطہ طور پر وہ پروفیسر نیر مسعود سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ نیر صاحب اس بات سے بہ خوبی واقف تھے کہ رجب علی بیگ سرور نے پبلشروں کی فرمایش پر اپنے متن میں کتنی ہی بار تبدیلیاں کی ہیں۔ نیر مسعود کو اس بات کی فکر لاحق تھی کہ فسانۂ عجائب کا وہ کون سا نسخہ ہوگا جس پر متن کی بنیاد رکھی جائے۔ ان تمام باتوں کے مدنظر رشید حسن خاں، نیر صاحب کو فسانۂ عجائب کے حوالے سے خطوط بھی لکھتے تھے کہ فسانۂ عجائب کے متن نے انھیں تھکا مارا ہے۔ اس کی قرأت کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن جب رشید حسن خاں فسانۂ عجائب کے متن کی کتابت مکمل کرا چکے تو انھیں خدابخش لائبریری پٹنہ میں رجب علی بیگ سرور کے ہاتھ سے لکھا ہوا افضل المطابع کا چھپا ہوا نسخہ ملا۔ اس نسخے کے دستیاب ہونے کے سبب خاں صاحب کی برسوں کی محنتِ شاقہ اکارت ہوگئی۔ نئے سرے سے متن کی کتابت کرائی گئی۔ پروفیسر نیر مسعود نے کاظم علی خاں کو یہ بھی بتایا کہ رشید حسن خاں چاہتے تو ایک ضمیمہ کتاب کے آخر میں لگا دیتے اور تحریر کر سکتے تھے کہ ''خدابخش لائبریری پٹنہ'' میں ایک نسخہ کتابت ہونے کے بعد مل گیا ہے۔ لیکن خاں صاحب نے ایسا نہیں کیا بل کہ نئے سرے سے سارا کام کیا۔ رشید حسن خاں نے تحقیق کے اصولوں کو تدوین میں مروج کرتے ہوئے دوسرے افراد کو اس میدان کی خارزاری اور جاں فشانی سے واقف کرایا۔ پروفیسر نیر مسعود نے فسانۂ عجائب پر ایک مفصل، مربوط و مبسوط اور عالمانہ تبصرہ 'کتاب نما' جلد 30، شمارہ 8، اگست 1990 کو لکھا۔ اپنے تبصرے میں انھوں نے اُن نکات پر بھی نقطۂ نظر پیش کیا جن سے عام قارئین واقف نہیں۔ خود نیر مسعود فسانۂ عجائب کی تدوین اور اس کی اشاعت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے۔ جب فسانۂ عجائب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی تو اس کے بارے میں پروفیسر نیر مسعود نے لکھا:

> ''آخر ''فسانۂ عجائب'' مرتبہ رشید حسن خاں منظرِ عام پر آ گئی۔ اس اڈیشن کی تکمیل اور اشاعت کے درمیان کئی برس کا فاصلہ ہے۔ کچھ یہی صورت اصل کتاب ''فسانۂ عجائب کے ساتھ بھی پیش آئی تھی جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور اور اس کے پہلے اڈیشن (1259ھ) کی نثر خاتمہ میں اس طرح شروع کرتے ہیں:
>
> ''برسوں یہ فسانہ کسادبازاریِ زمانہ سے تہہ رہا، مشہور نہ ہوا۔''
>
> رشید حسن خاں کا یہ اڈیشن بھی برسوں تہہ رہا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز اس کی ترتیب کے آغاز کے ساتھ ہی ہوگیا تھا۔ اُردو تحقیق کی عام روش سے رشید حسن خاں کو سخت شکایتیں ہیں اور انھوں نے بعض محققوں کے مرتب کیے ہوئے کلاسیکی متون کی بے دردی سے چیر پھاڑ کی ہے۔ اس لیے یہ خبر خاصی دل چسپی کے ساتھ سُنی گئی تھی کہ اب رشید حسن خاں خود ایک کلاسیکی متن، اور وہ بھی ''فسانۂ عجائب'' کا سا خطرناک متن، مرتب کر رہے ہیں۔ یہ تجسس پیدا ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خاں متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں اسے خود کہاں تک قائم رکھ پاتے ہیں۔ اس اڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوینِ متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کر دیا ہے، اور اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ابھی تک اُردو نثر کا کوئی متن اس شان کے ساتھ مرتب نہیں ہوا تھا۔ تدوین کا یہ کام رشید حسن خاں نے 1978 کے قریب شروع کیا تھا۔''

رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب'' کے مقدمے میں کئی جگہ اس بات کا اعتراف کیا کہ انھوں نے نیّر مسعود کی کتاب 'رجب علی بیگ سرور' سے استفادہ کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے

اپنے مقدمے کے صفحہ 27 پر نیّر مسعود کی کتاب کے حوالے اور اس کی اشاعت کی بابت لکھا:

''ڈاکٹر نیّر مسعود کی کتاب رجب علی بیگ سرور میں بھی اشاعت اول کی تفصیلات مندرج ہیں اور انھوں نے مجھے خود بتایا جب یہ تفصیلات دراصل موخر اشاعت سے منقول ہیں، اشاعت اول اُن کی نظر سے بھی نہیں گزری۔''

فسانۂ عجائب کے مقدمے کے صفحہ 31 پر رشید حسن خاں رجب علی بیگ سرور کی وفات اور نیّر مسعود کی اس ضمن میں تحقیق کے بارے میں لکھا کہ نیّر مسعود صاحب نے اُن کے سالِ وفات کی مختلف تاریخوں پر بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ سرورؔ نے محرم 1286ھ میں 14 اپریل اور 14 مئی 1869 کے درمیان کسی تاریخ کو انتقال کیا۔ رشید حسن خاں نے اسی صفحے پر سطر نمبر 13 پر نیّر مسعود کے اُس قول کو نقل کیا جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ رجب علی بیگ سرور فارسی سے واقفیت کم رکھتے تھے اور عربی پر انھیں دسترس حاصل تھا۔ رشید حسن خاں نے نیر مسعود کی کتاب کا حوالہ نقل کرتے ہوئے لکھا:

''بہ قول نیّر مسعود: سرور کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی سے بہ خوبی اور کم سے کم کام چلانے بھر عربی سے واقف تھے...مگر فارسی لکھنا سرور کو نہ آسکا۔ انشائے سرور میں اُن کے جو فارسی خط شامل ہیں، وہ عجب بے کسانہ اندازِ تحریر کا نمونہ پیش کرتے ہیں اُن کی عبارت کے الفاظ و مسادر تو فارسی ہین، لیکن حقیقتاً اُن کو فارسی میں لکھی ہوئی اُردو کہا جاسکتا ہے....اُردو زبان میں سرور نے واقعی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔''

خاں صاحب نے فسانۂ عجائب کی تدوین کے سلسلے میں نیّر مسعود سے بہت سی تفصیلات معلوم کی تھیں۔ فسانۂ عجائب کے نام کے سلسلے میں بھی رشید حسن خاں نے نیّر مسعود کی کتاب کا حوالہ پیش کیا ہے۔ الغرض، رشید حسن خاں نے نیّر مسعود کی کتاب کے حوالے اپنے مقدمے میں جگہ جگہ پیش کیے اور اس بات کا صدق دل سے اعتراف کیا کہ نیّر مسعود کی کتاب ان کے لیے بالخصوص فسانۂ عجائب کی تدوین میں بہت ہی مددگار ثابت ہوئی ہے۔

پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے حوالے سے کئی مضامین سپردِ قلم کیے۔ یہ مضامین رسالہ اظہار ممبئی، اُردو ادب نئی دہلی اور ایوانِ اُردو کے صفحات کی زینت بنے۔ ان مضامین میں نیر صاحب نے خاں صاحب کی کئی کتابوں کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا۔ مضامین کے علاوہ انھوں نے خاں صاحب کے خطوط کو ان کی وفات کے بعد اُردو ادب نئی دہلی کے علاوہ رسالہ نیا دور، لکھنؤ میں شائع کرایا۔ ان خطوط کا مطالعہ ہر اُس قاری اور ریسرچ اسکالر کے لیے ناگزیر ہے جسے رشید حسن خاں کی تحقیق اور تدوین سے تھوڑی بہت بھی شد بد ہے۔ نیر مسعود اور ان کی بیٹیوں صائمہ اور ثمرہ کے نام لکھے گئے خطوط میں علم و ادب کی وہ نادر باتیں تحریری ہیں جنھیں پڑھ کر تحقیق کے نئے گوشے وا ہوتے ہیں۔ نیر مسعود نے ان خطوط میں رشید حسن خاں کے اُس خط کو بھی شامل کیا ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ 'اپریل 1998 میں رسالہ ایوان اُردو نئی دہلی میں 'مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں' کے عنوان سے مضمون شائع ہوا تھا، کو مثنویاتِ شوق کی اشاعت کے وقت ترمیم کے ساتھ شامل کیا جائے گا۔ لیکن جب رشید حسن خاں کی کتاب 'مثنویاتِ شوق' منظرِ عام پر آئی تو اس میں کسی بھی طرح کی تبدیلی نہیں کی گئی تھی اور جو باتیں مضمون میں شامل تھیں وہی باتیں من و عن کتاب میں موجود تھیں۔ مثنویاتِ شوق کے مقدمے میں رشید حسن خاں نے صفحہ 164 پر پروفیسر نیّر مسعود کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ ''نیّر مسعود صاحب نے مثنویاتِ شوق کے کئی اہم نسخے بلا تکلف میرے پاس بھیج دیے اور خطوں کے جواب پابندی سے لکھتے رہے۔ البتہ ان تمام باتوں کے درمیان رشید حسن خاں نے مدیرِ ایوانِ اُردو اور کتاب کے ناشر کے نام خطوط ارسال کیے تھے کہ ان کا مضمون شائع نہ کیا جائے کیوں کہ مضمون میں بہت سی باتوں کو رد کیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ناشر نے اپنی مجبوریوں کا حوالہ دیتے ہوئے کتاب شائع کی۔ رسالہ ایوانِ اُردو اپریل 1998 کے شمارے میں رشید حسن خاں کے مضمون کے شائع ہونے کے بعد پروفیسر نیر مسعود نے ایک جوابی خط نما مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں' رسالہ ایوانِ اُردو کے مدیر مخمور سعیدی کے نام روانہ کیا۔ لیکن 21 مئی 1998 کو خود پروفیسر نیر مسعود نے ایک اور خط مخمور سعیدی کے نام تحریر کیا کہ ان کا مضمون نما خط 'بہ نام رشید حسن خاں' شائع نہ کیا جائے۔ نیز یہاں بھی مدیر رسالہ نے رسالے کے پریس میں ہونے کی بات کہی اور اس طرح پروفیسر نیر مسعود کا خط نما مضمون ایوانِ اُردو میں جولائی 1998 کے شمارے میں شائع ہو گیا۔ اس خط نما مضمون کے شائع ہونے کے بعد پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے نظریات کے حامی اور مخالف صف بندی پر اُتر آئے۔ یہ ادبی بحث اپنے وقت کی علمی اور علاقائی بحث بن کر قارئین کو متاثر کرنے لگی۔ اس بحث میں عام قاری سے لے کر پروفیسران تک نے حصہ لیا۔ بالآخر اس بحث کو مخمور سعیدی کی مداخلت کے بعد بند کر دیا گیا۔ لیکن یہ سارا ادبی معاملہ اور معرکہ ایوانِ اُردو نئی دہلی کے صفحات میں محفوظ ہو چکا تھا۔ اب ذرا رشید حسن خاں کے اُس مضمون پر بھی غور کر لیا جائے جس کے شائع ہونے کے بعد بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اپنے مضمون میں رشید حسن خاں نے دعوا کیا تھا کہ لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرے میں اخلاقی قدروں میں جو زوال یا گراوٹ آئی ہے وہ یہاں کے امرا و نوابین کی دین ہے۔ رشید حسن خاں نے اپنے دعووں کی دلیل کے لیے گذشتہ لکھنؤ کے حوالے نقل کیے۔ رشید حسن خاں کے نزدیک نواب مرزا شوق کی مثنویاں نہ صرف ان کی خود نوشت ہیں بل کہ یہ لکھنوی معاشرت کی جہتوں کی بہترین مثال اور ترجمان ہیں۔ اس ضمن میں خاں صاحب نے اودھ کی تاریخ و سیاست پر طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ لکھنؤ کے پہلے حکمراں نواب برہان الملک بہادر انسان تھے۔ تلوار ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہی اور زندگی کا بیش تر حصہ میدانِ جنگ میں گزرا۔ لیکن ان کے جانشینوں نے اودھ جیسی سرسبز و شاداب ریاست کو اپنی کم علمی اور عیش کوشی کے سبب تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ رشید حسن خاں نے لکھنؤ کی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے لکھا:

''اودھ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اُس وقت آیا جب انگریزوں نے اپنی تدبیر جہاں بانی کے تحت اودھ کے حکم راں غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔ برہان الملک کے زمانے سے اُس وقت تک اودھ کے حکمراں ''نوّاب وزیر'' کہلاتے تھے اور اپنے کو رسماً اور روایتاً سلطنتِ دہلی کا ماتحت تصوّر کرتے تھے۔ یہ لازم تھا کہ اِس تبدیلی کے بعد یہ نئی بادشاہت ہر لحاظ سے یہ کوشش کرے کہ اِس روایتی زیردستی کے سارے نقش مٹ جائیں اور یہاں وہ سب کچھ نئے انداز کا اور اپنے انداز کا ہو جس سے ایک طرف بادشاہت کے تصوّر کی تکمیل ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک متمائز معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ عسکریت کی روایت پوری طرح ختم ہو چکی تھی۔ زمین کے مالک تو بہ ظاہر بادشاہ سلامت تھے، لیکن زمین کی محافظ فوج کے مالک انگریز تھے۔ رزیڈنٹ بہادر کی مرضی کے خلاف کوئی نیا فرماں روا اِس نئے تختِ بادشاہت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اہم سیاسی اور فوجی مسائل و معاملات کی وسعت ختم ہو چکی تھی البتہ مذہبی آزادی پوری طرح باقی تھی اور تہذیبی وسعت بڑھتی جاتی تھی۔

اِس کے بعد یہی ہو سکتا تھا کہ جتنی تبدیلیاں، ایجادیں اور اضافے ہوں، وہ سب مذہبی رسوم، آدابِ معاشرت اور ادبی روایات سے متعلّق رہیں اور یہی ہوا۔ اِس میں شک نہیں کہ جلد ہی لکھنؤ میں ایک نئی معاشرت کا خاکہ تیّار ہو گیا، تہذیب کا ایک نیا انداز سامنے آنے لگا، شاعری میں ایک نیا انداز نمایاں ہونے لگا اور ایک نئی لسانی روایت بننے لگی؛ مگر تہذیبی مظاہر کی نمود اور (تہذیبی) تشکیل و ارتقا کا عمل تو بہت سست رفتار ہوا کرتا ہے۔ طویل مدّت درکار ہوتی ہے مختلف عناصر کو تہ نشیں ہونے کے لیے۔ اگر کوشش کر کے چیزوں کی شکل صورت کو بدل دیا جائے تو پھر مجموعی طور پر تصنّع اور ساختگی کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا۔ سطح پر بہت کچھ ہوگا جو تابناک ہو سکتا ہے، مگر حقیقتاً وہی عالم ہوگا جیسے سارے نقش ریت پر بنائے گئے ہوں۔''

نئی سیاسی تبدیلیوں کے مدِّنظر معاشرے میں طوائفوں کا نیا طبقہ نمودار ہوا۔ جس نے دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ میں اپنے وجود کو نہ صرف استحکام بخشا بل کہ اشرافیہ طبقے میں اپنی موجودگی کے سبب یہ طبقہ جلد ہی مقبول و مشہور ہو گیا۔ اس نئے طبقے نے بادشاہوں، نوابین اور امرا کے دربار سے لے کر گھر بار تک رسائی حاصل کی۔ ان طوائفوں کو امیر گھرانے تہذیب و تمدن کا مرکز تسلیم کرتے تھے۔ امیر زادوں کے صاحب زادے طوائفوں کے یہاں محفلوں کے آداب سیکھنے جاتے تھے۔ اب طوائف عزاداری کے جلسوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ ان تمام امور پر رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں ان کا تذکرہ یوں کیا:

''طوائف کو اِس معاشرے میں تہذیبی نمایندگی کا شرف مل گیا تھا۔ طوائف (پوری دنیا کی طرح) دہلی میں بھی تھی؛ مگر وہاں اِس کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہو سکی جو اِس معاشرے میں حاصل تھی۔ دہلی تو پھر بھی دور تھی؛ وہ علاقے جو لکھنؤ سے قریب تر تھے اور حکومتِ لکھنؤ کے ماتحت تھے، جیسے ملیح آباد اور کاکوری؛ وہاں بھی طوائف کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ کہیں اور اِس کو یہ حیثیت حاصل ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ حالات ہی کہیں اور کارفرما نہیں تھے جن سے لکھنؤ کی اِس خاص معاشرت کی صورت گری ہوئی تھی اور اسے آب و رنگ ملا تھا۔ اِس معاشرے میں طوائف کی اہمیت اور حیثیت کا اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عزاداری جیسی مذہبی چیز بھی اُن کی دسترس سے باہر نہیں رہی تھی۔''

رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں مثنویاتِ شوق کا تاریخی، تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی زاویے سے جائزہ لیا۔ ان مثنویوں کی زبان و بیان اور اسلوب کا بھی محاکمہ پیش کیا گیا۔ ان مثنویوں کے کرداروں بالخصوص مہہ جبیں اور مہہ لقا کے کرداروں کے ذریعے لکھنوی معاشرے کا حقیقی تجزیہ پیش کیا گیا۔ مرزا شوق کے ان نسوانی کرداروں نے جس طرح کے اشعار اپنی زبان سے ادا کیے ان سے یہی ثابت ہوا کہ لکھنؤ کی زیادہ تر عورتوں کا کردار پاک صاف نہیں ہے۔ یہاں تک کہ حیدری بیگم نے واجد علی شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

کہا: جمل ثابت علی خاں کا ہے
خطا کی، خطا کام انساں کا ہے
نہیں میں فقط ایک تقصیر وار
کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار

اسی طرح کی ہی باتیں مرزا شوق نے فریبِ عشق میں یوں کہی ہیں:

رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں
بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
کُھلتا ہر اک پر اِن کا حال نہیں
کون ہے اِن میں جو چھنال نہیں

مذہبی آستانوں کو شریف عورتوں اور مردوں نے اپنے لیے عیش کوشی اور لذت پرستی کا اڈہ بنا لیے تھے فریبِ عشق میں نواب مرزا شوق نے اس بارے میں لکھا:

وضع کی گو تھی سب کو پابندی
پر نہ پچتی تھی کوئی نوچندی
دوست جتنے تھے، رہتے تھے ہمراہ
کربلا میں کبھی، کبھی درگاہ
رہتا تھا تیرھویں کا جلسہ یاد
شام سے جاتے تھے حسین آباد
دوپہر رات جب گزرتی تھی
ڈولی پر ڈولی پھر اُترتی تھی

ان تمام باتوں کے درمیان رشید حسن خاں نے ان مثنویوں کوادب کا ایک حصہ اور لکھنوی معاشرے کا ترجمان قرار دیا۔انھوں نے اس بات کو پورے وثوق کے ساتھ مسترد کیا کہ مرزا شوق نے ان مثنویوں کولکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے تخلیق کیا تھا۔انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ان مثنویوں میں ہمیں اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں اوران مثنویوں کے رنگ اور ڈھنگ بہت ہی شوخ اور رنگین ہیں۔مضمون کے آخر میں رشید حسن خاں نے اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے جو تجزیہ پیش کیا اس میں یہ بھی لکھا کہ دبستانِ لکھنؤ کی ادبی جہات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بھی ان مثنویوں کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔انھوں نے ان مثنویوں کی زبان ،لکھنؤ پر دہلی کے اثرات ،لکھنؤ کی نفاست، نزاکت، زبانِ محلات کے علاوہ ناسخ اور شوق کی زبان کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا۔ان تمام باتوں کوانھوں نے یوں تحریر کیا:

''دبستانِ لکھنؤ کی ادبی اورلسانی جہات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بھی اِن مثنویوں کی اہمیّت ہمیشہ برقرار رہے گی۔عہدِ ناسخ کی شعری روایت اورتلامذۂ ناسخ کے قواعدِ شاعری سے متعلّق بیانات کا جولوگ جائزہ لینا چاہیں گے، یہ مثنویاں اُن کے مطالعے کا لازمی جز رہیں گی۔ یہ ایک طرف تو لسانی سطح پر عہدِ ناسخ میں زبانِ لکھنؤ پر دہلی اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں اور دوسری طرف ناسخ اور تلامذۂ آتش و ناسخ کے شعری اسالیب کے مقابلے میں ایک متوازی شعری اسلوب کی آئینہ دار ہیں۔یہی نہیں،''زبانِ محلات'' کی ایسی اوراتنی روشن اور دل کش مثالیں اِن مثنویوں میں یک جا ہوگئی ہیں کہ اِن کو پڑھ کر زبانِ لکھنؤ کی لطافت اور نفاست کی پوری روایت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔اِن مثنویوں کو الگ رکھ دیجیے تو پھر نفیس زبان اور لطیف اندازِ بیان کا ذخیرہ کچھ کم معلوم ہوگا، ناتمام اور کم رنگ نظر آئے گا۔زبانِ لکھنؤ کے جس لوچ، نرمی اور ریشمی پن کی تعریف کی جاتی ہے، وہ ناسخ اور اُن کے متّبعین کے یہاں نہیں ملے گا۔وہ تو نوّاب مرزا شوق کی مثنویوں میں محفوظ ہے(یا پھر ایک دوسری سطح پر میر انیس کے مرثیوں میں)۔بہ قولِ مولانا عبدالماجد دریابادی:

''محاورات پر یہ عبور، بیگمات کے روزمرّہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحّت، بیان کی یہ سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوّت کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے؟''۔

پروفیسر نیر مسعود نیرشید حسن خاں کے اسی مضمون کو بنیاد بنا کر رسالہ ایوانِ اُردو، نئی دہلی کے مدیر مخمور سعیدی کے نام 'بہ نام رشید حسن خاں' کے عنوان سے ایک جوابی خط تحریر فرمایا۔یہ خط مئی 1998 میں تحریر کیا گیا تھا۔اس ادبی تنازعہ کی روداد کو پروفیسر نیر مسعود نے رشید حسن خاں کی وفات کے بعد اپنے مضمون 'رشید حسن خاں خطوں کے آئینے میں' (سہ ماہی اُردو ادب، نئی دہلی، جنوری، فروری، مارچ 2007) کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا:

''رشید حسن خاں نے 'مثنویاتِ شوق' پر اپنے مقدمے کا وہ حصہ جولکھنوی معاشرت سے متعلق تھا،'مثنویاتِ شوق' لکھنوی معاشرت کے آئینے میں' کے عنوان سے ماہ نامہ 'ایوانِ اُردو' (نئی دہلی) کے اپریل 1998 کے شمارے میں شائع کرایا۔یہ مضمون کسی بھی طرح ان کے سے ذمے دار محقق کے شایانِ شان نہیں تھا اوراس میں قریب قریب ہر قسم کی تحقیقی اور تنقیدی بے راہ روی اختیار کی گئی تھی۔میں نے اس کی کچھ بہت نمایاں خامیوں کا جائزہ لیا اوراسے یکم مئی 1998 کو''بہ نام رشید حسن خاں (بہ حوالۂ مضمون مثنویاتِ شوق۔لکھنوی معاشرت کے آئینے میں)'' کے عنوان سے 'ایوانِ اُردو' میں چھپنے کو بھیج دیا۔میں نے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کیا ان کا یہ مضمون اسی صورت میں ان کی مرتب کردہ 'مثنویاتِ شوق' میں شامل ہوگا؟ خاں صاحب نے فوراً جواب دیا، اپنے مضمون کو پھر سے لکھنے کا وعدہ کیا اور خواہش کی کہ میں 'ایوانِ اُردو' کی مدیر مخمور سعیدی صاحب کو خط لکھ دوں کہ وہ میرا مضمون شائع نہ کریں۔انھوں نے کتاب کے ناشر کو بھی خط لکھ دیا کہ ان کے مضمون کو روک لیا جائے کیوں کہ وہ اسے از سرِ نو لکھیں گے۔یہ خط مجھے 5 رمئی کو مل گیا اور میں نے اسی دن مخمور صاحب کو ممانعتی خط لکھ دیا اور رشید حسن خاں کو اس کی اطلاع کردی۔خاں صاحب کے کہنے پر 21 مئی 1998 کو میں نے مخمور صاحب کو یاددہانی کا ایک اور خط لکھا کہ میرا مضمون شائع نہ کیا جائے۔لیکن جولائی 1998 کے 'ایوانِ اُردو' میں دیکھا کہ میرا مضمون شامل ہے۔میں نے مخمور صاحب کو احتجاجی خط لکھا

بحث کا نشانہ بنانا پسند نہ کریں گے، لیکن مخمؔور صاحب نے اپنے جواب میں لکھا کہ چوں کہ خاں صاحب کا مضمون 'ایوانِ اُردو' میں چھپا تھا اس لیے اس پر ایرادت بھی اسی رسالے میں چھپنا ضروری تھے۔ اُدھر انجمن ترقی اُردو سے 'مثنویاتِ شوق' چھپ کر آ گئی۔ وہاں خاں صاحب کی ممانعت پر دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ ان کا مضمون کسی ردوبدل کے بغیر اپنی سابقہ صورت میں شاملِ کتاب ہے درحالے کہ وہ اسے بدلنا چاہ رہے تھے۔''

پروفیسر نیر مسعود نے اپنے مضمون 'رشید حسن خاں خطوں کے آئینے میں' اُس خط کو بھی شامل کیا جس میں مثنویاتِ شوق کے حوالے سے باتیں (مضمون ایوانِ اُردو اپریل 1998) تحریر کی گئی تھیں۔ نیر صاحب نے اس خط کے غیر ضروری حصوں اور اُن باتوں کو حذف کیا جن میں بہت ہی کڑوی کسیلی باتیں لکھی گئی تھیں یا جن کا منظرِ عام پر آنا کسی تنازعہ کا سبب بن سکتا تھا۔ لیکن 12 مئی 1998 کو لکھے گئے اس خط میں اُن تمام باتوں (بالخصوص مثنویاتِ شوق اور مخمور سعیدی کے رویے پر حیرانی) کا احاطہ کیا گیا جنھیں رشید حسن خاں نے اپنے مضمون میں پیش کیا تھا۔ رشید حسن خاں نے نیر مسعود کو لکھا:

''شاہ جہاں پور، 12 مئی 1998

نیر صاحب!

ابھی 5 رمئی کا خط ملا۔ اطمینان ہوا۔ دہلی خط لکھ چکا ہوں۔ 21 مئی کو وہاں جانا ہے انجمن کی میٹنگ میں، اپنے سامنے اس کام کو کرا دوں گا۔ وہ مضمون 'مثنویاتِ شوق' کا تمہیدی حصہ ہے۔ انجمن سے ابھی تک یعنی آج تک میرے خط کا جواب نہیں آیا ہے۔ یہ خط پہلے آیا تھا کہ کتاب چھپ گئی ہے۔ میں نے لکھا کہ اسے فوراً روک دیا جائے، کیوں کہ اس حصے کی کتابت ازسرِ نو ہوگی۔ اس خط کے جواب کا انتظار ہے۔ خیر، 21 مئی بھی دور نہیں ہے۔ آپ نے بر وقت توجہ دلائی اس کے لیے ممنون ہوں۔ خدا کرے دہلی والے کچھ شرارت نہ کریں۔ جی لگا ہوا ہے کہ مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ایک خط آج پھر ابھی لکھ رہا ہوں۔

ہاں برادر! ڈاک کا احوال برا ہے آج کل۔ اگر آپ غیر مناسب نہ سمجھیں تو مخمؔور کو ایک احتیاطی خط لکھ دیں۔ وہاں جناب.... بھی تو ہیں، ان کی شرارت سے ڈرتا ہوں۔ آپ بھی ان کو خوب جانتے ہیں۔ خط لکھ ہی دیجیے اس وجہ سے۔ احتیاط اچھی ہوتی ہے۔''

ایوانِ اُردو، جولائی 1998 میں اس مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں، لکھنوی معاشرت کے آئینے' کے شائع ہونے سے پہلے پروفیسر نیّر مسعود نے ایوانِ اُردو کے مدیر مخمور سعیدی کے نام خطوط ارسال کیے تھے۔ تاکہ خاں صاحب کے نام لکھا گیا خط نما مضمون شائع نہ ہو۔ البتہ مضمون شائع ہوا۔ پروفیسر نیّر مسعود نے رشید حسن خاں کے نام ایک معذرتی خط 29 جون 1998 کو تحریر کیا تاکہ اس ادبی طوفان کو روکا جا سکے۔ خط ملاحظہ فرمائیں:

بسمِ

نیّر مسعود — ادبستان، دین دیال روڈ لکھنؤ 226003

29 جون 1998

برادرم خاں صاحب آداب

کچھ دیر قبل ''ایوانِ اُردو کا جولائی کا شمارہ ملا تو دیکھتا ہوں اس میں میرا خط موجود ہے۔ یہ مخمور صاحب کے نام میرے مسلسل دو خطوں میں تاکیدی ممانعت کے باوجود ہوا ہے۔ میں نے ابھی ابھی ان کو احتجاجی خط لکھا ہے اور دریافت کیا ہے کہ صحافتی آداب کی یہ خلاف ورزی کیوں کی گئی ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے مجھے آپ کا یہ اندیشہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں دہلی کی ادبی سیاست در آئی ہے۔ بہر حال آپ سے شرمندہ ہوں۔

معلوم نہیں آپ کا بمبئی والا پروگرام کس حد تک عملی ہوا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو پا رہا ہے کہ یو پی اُردو اکادمی کی انعامی تقریب کا کیا بنا۔ البتہ وزیر اعظم کے عن قریب لکھنؤ آنے کی خبر ہے۔ ممکن ہے تقریب اسی موقع پر رکھی جائے۔

دردِ سر نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔

ثمرہ صائمہ آداب لکھوا رہی ہیں۔ صائمہ انٹر کے امتحان میں سکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی ہے۔

آپ کا

نیّر مسعود

رشید حسن خاں نے نیر مسعود کو جوابی خط تحریر کیا۔ اس خط میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ ان کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا اور نہ ہی کسی کے مذہب پر چوٹ کرنا تھا۔ خاں صاحب چاہتے تھے کہ اب اس بحث کو یہیں روک دیا جائے نہیں تو غیر ضروری چیزیں سامنے آئیں گی۔ خط میں یہ بھی تحریر کیا گیا کہ یہ خط صرف آپ کے لیے (نیر مسعود کے

سامنے پیش کیا جارہا ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ ایک معاصر ادیب اپنے دوسرے معاصر ادیب کے خیالات اور جذبات کو کس طرح سمجھ اور پرکھ رہا ہے:

''دیکھئے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہیں آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی (انجمن ترقی اُردو (ہند) کو) ابھی خط لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اُس حصے کو از سرِ نو لکھوں گا، تاکہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاس داری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بروقت بات سامنے آگئی اور بآسانی اُسے بنایا جا سکتا ہے...آپ اپنے احباب سے اِس خط کے حوالے سے یہ باتیں کہہ سکتے ہیں، البتہ یہ خط صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اِس پر غور کر لیجیے کہ جب اس تحریر کو از سرِ نو لکھا ہی جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں...اِس بنا پر کیا مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے۔''

(سہ ماہی اُردو ادب، جنوری تا مارچ 2007، صفحہ 235، محررہ 2 مئی 1998 بنام نیر مسعود)

رشید حسن خاں کا خط ملتے ہی نیّر مسعود نے ''ایوانِ اُردو'' کے مدیر مخمور سعیدی کو خط لکھا کہ خاں صاحب کے خلاف ان کا مراسلہ 'بہ نام رشید حسن خاں' کو شائع نہ کیا جائے۔ مخمور سعیدی نے پروفیسر نیر مسعود کو جوابی خط میں لکھا کہ جب آپ کا خط موصول ہوا تو جولائی کا شمارہ پریس میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا۔ اِس بابت مخمور سعیدی مرحوم (م 2010) لکھتے ہیں:

''جب آپ (نیّر مسعود) کے دو خط (تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد) یکے بعد دیگرے اُس کی اشاعت روک دینے کے بارے میں موصول ہوئے، اس وقت تک جولائی کا شمارہ چھپ کر تیار ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کا خط اس میں حذف کر دیا جائے۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، اگست 1998، صفحہ 57)

پروفیسر نیر مسعود نے اپنے مضمون 'بہ نام رشید حسن خاں' میں رشید حسن خاں کے علم اور ان کے جملہ تحقیقی کارناموں کا اعتراف اور ستایش کرنے کے بعد لکھا کہ ادھر آپ کے مضمون ''مثنویاتِ شوق ،لکھنوی معاشرت کے آئینے کے حوالے سے مجھ پر طعنے پڑ رہے ہیں کہ ''آپ کے محققِ اعظم'' نے یہ مضمون جو لکھا ہے۔ نیر صاحب نے مزید یہ بھی لکھا کہ بھی آپ نے تو حد کر دی۔ میں آپ کو اب بھی اپنے عہد کے سب سے بڑے محققوں میں شمار کرتا ہوں، لیکن یہ مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیقی اصولوں کی جملہ خلاف ورزیوں ،غیر محققوں کی تحقیقی خرمستیوں اور ''ناتحقیقی'' ستم ظریفیوں کی مثال میں نمونے کے طور پر لکھا ہے۔ دراصل رشید حسن خاں نے اپنے مضمون کو جن ماخذات کی روشنی میں تیار کیا تھا ان میں:

1۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ (صرف منفی شواہد)

2۔ شرر، گذشتہ لکھنؤ (صرف منفی شواہد)

3۔ شوق، مثنویاں (صرف منفی شواہد)

4۔ پروفیسر آل احمد سرور (لکھنوی طوائفیں)

5۔ پروفیسر خورشید الاسلام (لکھنوی طوائفوں کی سوز خوانی)

کتابیں شامل تھیں۔ نیر مسعود نے رشید حسن خاں کو ان ماخذات کے علاوہ دیگر ماخذات سے استفادہ کرنے کی صلاح دی بالخصوص ''قدیم ہُنر و ہُنر مندانِ اودھ''، ''وضع دارانِ لکھنؤ''، ''امراؤ جان ادا'' اور نیا دور کے ''اودھ نمبر'' کو دیکھنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی انگریزی ادب میں جو کتابیں اودھ کی تہذیب، ثقافت اور معاشرے کے تعلق سے تحریر کی گئی ہیں انھیں بھی پڑھنے کا مشورہ رشید حسن خاں کو دیا گیا تاکہ آیندہ اس حوالے سے ان کے کسی بھی مضمون میں دیانت داری اور ایمان داری کے دیدار ہو سکیں۔ اس خط نما مضمون میں نیر صاحب نے یہ بھی لکھا کہ آپ (رشید حسن خاں) لکھنوی تہذیب و معاشرت سے نہ صرف نابلد ہیں بل کہ اس تہذیب کی ابجد سے بھی آپ کو واقفیت نہیں۔ نیر صاحب نے رشید حسن خاں کے مضمون کا سلسلے وار تجزیہ پیش کیا اور کئی جگہ سوالات بھی قائم کیے کہ رشید حسن خاں ان سوالات کا جواب بھی تحریر فرما دیں تاکہ آنے والی نسلوں کے اذہان میں لکھنوی تہذیب اور معاشرے کو لے کر کسی بھی طرح کی غلط فہمی اور بدگمانی نہ رہے۔ یہ خط نما مضمون بڑا ہی دل چسپ اور معلوماتی ہے۔ جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نیر مسعود کو خاں صاحب کے مضمون سے کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ بہر حال میں یہاں نیر مسعود کے خط نما مضمون کا ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین نیر مسعود کے دلی جذبات اور کیفیت سے واقفیت حاصل کر سکیں:

''برادرم خاں صاحب آداب!

خدا کرے آپ کی صحت بہ حال ہو۔ یہ خط کچھ بادلِ ناخواستہ لکھ رہا ہوں۔ قصّہ یہ ہے کہ اِدھر آپ کے مضمون ''مثنویاتِ شوق ،لکھنوی معاشرت کے آئینے'' (ایوانِ اُردو، اپریل 1998) کے حوالے سے مجھ پر طعنے پڑ رہے ہیں کہ ''آپ کے دوست'' اور ''آپ کے محققِ اعظم'' نے یہ مضمون جو لکھا ہے

اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ اتفاق سے ایوانِ اُردو کا یہ شمارہ میرے پاس نہیں آیا، لیکن ایک صاحب نے مجھے اس کی نقل بھجوا دی۔ بھائی، ''آپ نے تو حد کر دی۔ میں آپ کو اب بھی اپنے عہد کا سب سے بڑے محققوں میں شمار کرتا ہوں، لیکن یہ مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیقی اصولوں کی جملہ خلاف ورزیوں، غیر محققوں کی تحقیقی خرمستیوں اور ''ناتحقیقی'' ستم ظریفیوں کی مثال میں نمونے کے طور پر لکھا ہے۔ اب میں طعنوں کا جواب تو کیا دے پاتا، مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس مضمون کی سب نہیں کچھ قباحتوں کو آپ کے گوش گزار کر کے دریافت کروں کہ یہ معاملہ کیا ہے اور آپ کے سے محقق کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا۔

یہ مضمون اگر اپنے عنوان کی حدوں کے اندر ہی رہتا تو میں اس کے دفاع میں یہ کہہ سکتا تھا کہ خاں صاحب نے صرف یہ دکھایا ہے کہ شوق کی مثنویاں لکھنوی معاشرے کے کن پہلوؤں کا آئینہ نظر آتی ہیں اور مضمون کی بنیادی خامی یہ ہے کہ مضمون نگار نے ان مثنویوں کو سوچ سمجھ کر پڑھا اور اس ناقص مطالعہ کی وجہ سے ان آئینوں کی بعض تمثالیں انھوں نے نہیں دیکھیں (مثلاً زہرِ عشق کا دو تہائی حصہ جو ہیروئن کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے، اور جو اس مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب رہا ہے، مضمون نگار نے اس کو نظر انداز کر دیا اس بحث سے سروکار نہیں رکھا کہ وہ کون سے معاشرتی دباؤ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو محض اپنی محبت کا راز کھل جانے پر اس شہر لکھنؤ میں خودکشی کرنا پڑ گئی جہاں مضمون نگار کی رائے میں عورتوں مردوں کے ناجائز جنسی تعلقات عام تھے) مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ لکھنوی معاشرت کے موضوع پر اپنے برائے نام اور یک رُخے مطالعے کو کافی جان کر خود طبع آزمائی شروع کر دی۔ بھائی، کسی تہذیب اور معاشرے کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعے کے کیا آداب اور طریق کار ہوتے ہیں اس کی ابجد سے ناواقفیت کے باوجود اگر آپ کو قلم اُٹھانا ضرور تھا تو کم از کم اس موضوع پر غیر مربوط سا مطالعہ ہی کر لیتے۔ آپ کا عالم یہ ہے کہ ''گزشتہ لکھنؤ'' بھی آپ نے پوری طرح نہیں پڑھی، کمال الدین حیدر کی تاریخ تک (باوجود یہ کہ وہ انگریزوں کے لیے ان کے ایک وفادار نے لکھی تھی) آپ کی رسائی نہیں، نول کشور کی تواریخ نادر العصر، جو ایک انگریز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تحریر ہوئی تھی۔ (اس کا نام ہی ''تحفۂ کرنل ایبٹ'' ہے) وہ بھی آپ کے لیے مجہول رہی۔ لکھنؤ کی گھریلو معاشرت کا آپ کو پتا ہی نہیں اس لیے عباس حسین ہوش کی مثنوی ''تفسیر عفت''، ''فسانۂ نادر جہاں'' لکھنؤ کی عورتوں کے بارے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مجموعے (ہم جولی، قصہ اوّل و دوم) قسم کے ضروری ماخذوں سے آپ کی شناسائی نہیں۔ لکھنؤ میں طوائفوں کی حیثیت پر آپ فیصلہ کُن گفتگو کرتے ہیں اور ''امراؤ جان ادا'' تک کو اُٹھا کر نہیں دیکھتے کہ وہ آپ کی تائید کر رہی ہے یا نہیں۔ ''قدیم ہنر و ہنر مندان اودھ''، ''وضع دارانِ لکھنؤ'' حتیٰ کہ ماہ نامہ ''نیا دور'' کے دونوں حالیہ اودھ نمبر بھی آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ پیشگی فیصلہ کر لینے کے بعد جذبات اور تاثرات کی تابع تحقیق کو غیر جانب داری کے انداز میں پیش کرنا اور اپنے پیشگی جذباتی فیصلے اور قلبی خواہش کے برخلاف شواہد کو دیکھنے سے کنھیا لال کپور کے ''مسٹر ڈالر'' کی طرح بالارادہ معذور ہو جانا آپ کی تحقیق کی کمزوری رہی ہے۔ لیکن اس مضمون میں یہ کمزوری، ناقابلِ یقین حد تک بڑھ کر ''خواہش زدہ'' تحقیق کی مکمل مثال بن جاتی ہے۔''

نیر مسعود کے اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد کئی ادیب حضرات نے اس ضمن میں مضامین سپردِ قلم کیے۔ دہلی یونی ورسٹی کے پروفیسر عبدالحق نے ''مثنویاتِ شوق'' عنوان سے مضمون رقم کیا جو ایوانِ اُردو، ستمبر 1998 میں شائع ہوا۔ پروفیسر عبدالحق نے اپنے پیش رو دونوں ادبی بزرگوں کا پاس رکھتے ہوئے بہت سی کارآمد اور مفید باتیں اپنے مضمون میں تحریر کیں۔ موصوف نے نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے دوستانہ مراسم (علمی و ذاتی) پر بھی نکتہ چینی کی۔ پروفیسر عبدالحق نے نیر مسعود کے مضمون کی بنیاد ان پر پڑنے والی لعن طعن کو بنانے پر بھی خفگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید لکھا کہ مجھے نہ خاں صاحب سے غرض ہے اور نہ نیر مسعود صاحب سے کچھ لینا دینا۔ میرے لیے دونوں محترم ہیں اور دونوں کی علمی خدمات کا معترف ہوں۔ پروفیسر عبدالحق نے نیر مسعود، آل احمد سرور، خورشید الاسلام کی کاوشوں کی تعریف کی۔ ساتھ ہی پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب کی ادبی اور تنقیدی خدمات کا بھی ذکر کیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ پورا مضمون پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ پروفیسر عبدالحق نے یہ مضمون رشید حسن خاں کے مضمون اور نظریات کی تائید میں رقم کیا تھا۔ اس مضمون کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے تا کہ پروفیسر عبدالحق کے خیالات کی صحیح ترجمانی کی جا سکے:

''شعبہ کے سابق رفیق کار اور اُردو کے معروف محقق جناب رشید حسن خاں نے مرزا شوق کی مثنویوں پر مضمون لکھا اور طعنے پڑ رہے ہیں پروفیسر نیّر مسعود پر؟ کیوں کہ دونوں میں دوستی ہے۔ پتا نہیں اس دوستی کی بنیاد ذاتی تھی یا علمی و ادبی۔ یہ اگر علمی بنیاد پر قائم ہوتی تو جناب نیّر مسعود اپنے منصب اور مقام سے فروتر لہجہ اختیار نہ کرتے۔ شاید ان پر پڑنے والے طعن و تشنیع خاں صاحب کی طرف لوٹا دیے گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ دوسروں کے کہنے سننے یا لعن طعن کے ردِ عمل میں یہ مضمون لکھا گیا۔

حریم میرا خودی غیر کی معاذ اللہ

مجھے نہ خاں صاحب سے غرض ہے اور نہ نیّر مسعود صاحب سے کچھ لینا دینا ہے۔ میرے لیے دونوں محترم ہیں اور میں دونوں کی علمی خدمات کا معترف

بزرگی میں بھی سبقت اور فضیلت حاصل ہے، پاسِ احترام رکھنا چاہیے۔شاید انحطاط آمادہ معاشرے میں دانشوروں کے اظہار اور اسالیب کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔گذشتہ برسوں میں علی گڑھ کے بُزرگ اساتذہ کے درمیان غیر شائستہ مکالمہ زبان و دہن دونوں کے بگڑنے اور بد نمائی کا مظہر بنا رہا۔زوال زدگی میں قومی ضمیر اور اندازِ فکر کا بدل جانا قرین قیاس ہے۔ثقافت کی مجہول تعبیر اور منفی پہلوؤں پر زور (غیر شعوری طور پر) دانش و بنیش کے مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ان سے عام گم رہی پھیلتی ہے اور تہذیبی اقدار مذموم قرار پاتے ہیں۔دہلی ہو کہ لکھنؤ یہ سوادِ اعظم کی عظیم اور مقتدر ثقافت ہے۔ اس وراثت کو بدنام کرنے کی شعوری کوشش برطانی عہد سے آج تک جاری ہے۔تخلیق کاروں نے ابتدا کی۔مورّخوں نے نقادوں نے عیب جوئی میں سبقت لی۔فلموں کے علاوہ چند سیریل کے نام لے سکتا ہوں جن میں شراب و شاہد سے اس تہذیب کو مختص کیا گیا ہے۔مرزا غالبؔ جانِ عالم، کہکشاں زندہ مثالیں ہیں۔حیرت ہے کہ سردار جعفری جیسے بزرگوں کا قلم بھی اس سیاہی میں آلودہ ہے۔ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی تاریخ میں لکھنؤ دبستان ادب کو عقیدہ اور ناز و نخرہ سے تعبیر کیا ہے۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو دہلی، ستمبر 1998،ص 14)

ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی کے ستمبر 1998 کے شمارے میں ہی لطیف صدیقی کا مضمون ''مثنویاتِ شوق :لکھنوی معاشرت کے آئینے'' شائع ہوا۔اس مضمون میں لطیف صدیقی نے پروفیسر نیر مسعود کے اُن انگریزی حوالوں کا جائزہ پیش کیا جس میں دعوا کیا گیا تھا کہ رشید حسن خاں نے لکھنوی تہذیب کے تعلق سے انگریزی ادب کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔لطیف صدیقی نے John Premble کی انگریزی کتاب The Raj,The Indian Mutiny And The Kingdom Of Oudh کے حوالے نقل کیے۔ساتھ ہی لطیف صدیقی نے گذشتہ لکھنؤ کے انگریزی ترجمے اور جان پمبل کی کتابوں کے بھی اقتباسات لکھنوی تہذیب،معاشرت اور ثقافت کے حوالے سے پیش کیے جن میں لکھنؤ کے بگڑتے معاشرے کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔جان پمبل نے تو لکھنوی معاشرے کے زوال میں طوائفوں کے علاوہ اُن مردوں کو بھی ذمہ دار قرار دیا جنھوں نے عورتوں کی طرح جسم فروشی کے باقاعدہ اڈے بنا رکھے تھے۔اس بارے میں لطیف صدیقی نے اپنے مضمون میں تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا:

''لکھنؤ میں مردوں کے بھی جسم فروشی کے اڈّے تھے۔ہماری تہذیب کا یہ تاریک پہلو ہے۔جان پمبل کے مطابق:

"THE EXISTENCE OF MALE BROTHELS IS CONFOMED BY THE LUCKNOW HOSPITAL REPORT FOR 1848-49 WICH NOTICES THE CASES OF VENERAL DISASE PROCEEDING;AS-DR LECKIE DELICATELY PUT IT FROM OTHER THAN THE IRREGULATIES OF FEMALE PROSTITUION KHESE PRACTICES HAD BEEN MADE FASHION ABLE BY THE NAWAB ASAF -UD-DAULA,A NOTORIOUS CATAMITE-"(THE RAJ,THE MNTINY AND THE KINGDOM OF OUDH,1801-1859)

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو دہلی ستمبر 1998 صفحہ 17)

ماہ نامہ ایوانِ اُردو دہلی پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے مابین ہونے والے ادبی معرکے کا گواہ بنا۔اس ادبی بحث میں قارئین حضرات نے بھی حصہ لیا۔ستمبر اور اکتوبر 1998 کے شماروں میں کئی نامور ادیبوں کے خطوط اس ضمن میں شائع ہوئے۔ستمبر 1998 میں سہیل احمد، ڈاکٹر شمس بدایونی اور اختر شاہ جہاں پوری کے خطوط شامل رہے تو اکتوبر 1998 میں ساجد رشید ممبئی اور پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی کے خط اس ادبی بحث سے متعلق شائع ہوئے۔اس موقع پر میں ستمبر 1998 کے ایوانِ اُردو کے شمارے سے ڈاکٹر شمس بدایونی کا خط نقل کر رہا ہوں جس میں انھوں نے دونوں ادبی بزرگوں کا احترام کرتے ہوئے اس بات پر حیرانی اور افسوس ظاہر کیا کہ ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے۔اس کا نمونہ نیر صاحب کے تبصرہ فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ کتاب نما دہلی میں دیکھا تھا۔ڈاکٹر شمس بدایونی نے دونوں ادبی بزرگوں سے مودبانہ گزارش کی کہ اگر نیر صاحب نے اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں۔ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی لکھا کہ اگر لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب و احترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے۔خط ملاحظہ کیجیے:

''ایوانِ اُردو'' کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیّر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا۔نیّر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سبب میرے دل میں بڑا احترام ہے لیکن ان کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے۔اس کا نمونہ نیّر صاحب کے تبصرہ فسانۂ عجائب/ مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ کتاب نما دہلی میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے اس کا یہ دوسرا نمونہ ہے ایک ہی قلم سے بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے۔میری مودبانہ گزارش

ہے کہ نیّر صاحب نے اگر اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے، تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں اگر اس علم وفضل کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب واحترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے۔''

ڈاکٹر شمس بدایونی، بریلی

(ماہ نامہ، ایوانِ اُردو، دہلی، ستمبر 1998، صفحہ 58)

ایوانِ اُردو، اکتوبر 1998 میں قاضی عبیدالرحمٰن نے پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے درمیان پنپنے والی غلط فہمیوں کی جانب توجہ مبذول کی۔ قاضی صاحب کو نیر مسعود کا مضمون پڑھنے کے بعد افسوس ہوا۔ لیکن ساتھ ہی انھوں نے نیر مسعود کے اعتراضات کی حمایت بھی کی کہ رشید حسن خاں کو لکھنوی معاشرت پر لکھنے سے پہلے تمام ماخذات کو دیکھنا چاہیے تھا جس کی نشان دہی نیر مسعود نے کی ہے۔ قاضی صاحب اس بات سے بھی نالاں ہیں کہ نیر مسعود نے خط لکھ کر ایوانِ اُردو کے اگلے شمارے میں مضمون کی اشاعت پر حیرت اور رنج کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے مزید یہ بھی لکھا کہ نیر مسعود کو اگر اتنا ہی افسوس اور رنج ہے تو سرے سے اس مضمون کو کسی رسالے میں نہ بھیجتے۔ قاضی صاحب کے تمام معروضات درج ذیل خط میں موجود ہیں:

''محترم نیّر مسعود بھائی کا مضمون بہ نام رشید حسین خاں پڑھ کر قدرے افسوس ہوا۔ لکھنوی معاشرت کے بارے میں لکھنے کے لیے بے شک ان تمام ماخذات کو دیکھنا چاہتے تھے جس کی نیّر بھائی نے نشان دہی فرمائی ہے اور اس لحاظ سے خاں صاحب سے بے شک لغزش ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ جس پائے کے محقق ہیں اور انھوں نے کلاسیکی شاہ کاروں کے مطالعے میں جس تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، ان سے بعید ہے کہ وہ کم زور شہادتوں اور SECONDRY FORCES پر تکیہ کر کے اپنی بات کہی۔ البتہ نیّر بھائی جیسے سلیم الطبع اور غیر معمولی علمی صلاحیت رکھنے والے اسکالر سے بھی میں یہ اُمید نہیں کرتا کہ وہ اپنے ایک ہم پیشہ کی کوتاہیوں پر ایسی سرزنش کریں گے جیسا کہ انھوں نے کی ہے۔ اب چوں کہ خود انھیں بھی احساس ہے اور ایوانِ اُردو کے اگلے شمارے میں خط لکھ کر مضمون کی اشاعت پر حیرت اور رنج کا اظہار کیا ہے اس لیے مزید کچھ کہنا سننا عبث ہے۔ تاہم غالباً بہتر یہ ہوتا کہ نیّر بھائی اپنا یہ مضمون سرے سے کسی رسالے کو نہ بھیجتے اور اس درجہ تلخ کلامی کے بجائے ایک مثبت انداز کا مضمون لکھ کر لکھنوی معاشرت کے صحیح خدوخال واضح کر دیتے۔ ہم عصروں کی چپقلش کی یہ کوئی تنہا مثال تو نہیں ہے۔ لیکن جب یہ روایت دہرائی جاتی ہے تو اسکالرشپ کا قد گھٹ جاتا ہے۔''

قاضی عبیدالرحمان ہاشمی، نئی دہلی

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، اکتوبر 1998، صفحہ 58)

پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں وہ بہت جلد ہی ختم ہوگئی تھیں۔ رشید حسن خاں کی کتاب 'مصطلحاتِ ٹھگی' جب منظرِ عام پر آئی تو سب سے پہلے نیر مسعود نے ہی سہ ماہی اُردو ادب، نئی دہلی 2003 کے لیے 6 صفحات پر مشتمل تبصرہ تحریر کیا۔ رشید حسن خاں کی اس اہم تدوینی کاوش کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اب تک اُردو ادب میں ٹھگوں سے متعلق جو مواد فراہم تھا وہ ہماری دسترس سے باہر تھا۔ لیکن رشید حسن خاں نے اپنی محنتِ شاقہ اور تحقیقی مساعی سے اس عظیم کارنامے کو اُردو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کتاب کا انتساب ''دورِ حاضر کے ادبی ٹھگوں کے نام'' کیا گیا۔ پروفیسر نیر مسعود نے اس کتاب کی اہمیت، افادیت، معنویت اور اُردو لغت سازی کے باب میں اس کے مقام ومرتبے کے بارے میں بہت تفصیل کے ساتھ لکھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ٹھگوں کا بھی ایک باب قائم کیا جاتا ہے۔ ان ٹھگوں کا اپنے وقت میں بہت خوف تھا۔ ان ٹھگوں میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ دونوں ہی فرقے کے لوگ کالی دیوی کو اپنا خدا تسلیم کرتے تھے۔ لوٹ مار کرنے سے قبل دیوی کو بھینٹ دی جاتی تھی۔ ان ٹھگوں نے اپنے کام کرنے کے انداز کو اصطلاحی معنی عطا کیے ہوئے تھے۔ ایک ٹھگ دوسرے ٹھگ کی زبان کو بہ آسانی سمجھ لیتا تھا۔ دراصل یہ کوڈ ورڈ ہوتے تھے جنھیں ٹھگوں نے برسوں کی ریاضت کے بعد بنائے تھے۔ مسافروں کا قتل کرنا، ان کا مال اسباب لوٹ لینا ان ٹھگوں کا پیشہ تھا۔ بچوں اور عورتوں کا قتل یہ لوگ نہیں کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے انھیں دیوی کے ناراض ہونے کا خطرہ ہوتا تھا۔ پروفیسر نیر مسعود نے 'مصطلحاتِ ٹھگی' کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:

'ٹھگ' کا لفظ اُردو میں اپنے اصطلاحی معنی سے مختلف معنوں استعمال ہونے لگا ہے۔ اصطلاحی معنی میں 'ٹھگوں کا خواص ہے کہ مسافر کو مارے بغیر اس کا مال اپنے اوپر حرام جانیں'، لیکن اُردو محاورے میں ٹھگی کے ساتھ قتل وخون کا تصور نہیں ہے بل کہ دھوکا یا لالچ دے کر کسی کا مال یا منافع حاصل کرنا ہے۔ مثلاً نقلی یا کم قیمت مال کو اصلی اور قیمتی بنا کر مہنگا فروخت کر دینا یا زیورات کو دوگنا کر دینے کا دعوا کر کے ہتھیا لینا۔ لیکن اصلی ٹھگ میں شکار کا خون کر دینا ضروری تھا۔ ٹھگوں کے بڑے بڑے گروہ مسافروں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ لیتے تھے۔ ان کی ایک مخصوص تنظیم، رسوم ومعتقدات اور بولی تھی۔ یہ بہت راز دارانہ طریقے سے کام کرتے تھے اس لیے ان کی سرگرمیاں عام طور پر صیغۂ راز رہتی تھیں۔

ٹھگی کے خاتمے کے بعد تک ان لوگوں متعلق معلومات عام نہیں تھی، خصوصاً اُردو والوں کو ان کے متعلق بہت کم علم تھا، حالاں کہ اُردو میں 'مصطلحاتِ ٹھگی'، 'واقعات عجیب وغیرہ' وغیرہ انیسویں صدی میں لکھی جا چکی تھیں۔ اُردو میں ٹھگی پر فلپ میڈوز ٹیلر کے ناول 'کنفشنس آف اے ٹھگ' کے اُردو

ترجموں نے عام اُردو دنیا کو ٹھگوں کی تنظیم اور ان کے طریقِ کار سے روشناس کرایا۔ یہ ایک ٹھگ امیر علی کی داستان حیات کے طور پر لکھی گئی ہے۔اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ان میں حسن جعفری کا ترجمہ غالباً سب سے مکمل ہے جو ایک بار پھر 1998 میں چھپا۔اس پر مترجم کے علاوہ آصف فرخی کا بھی مفید دیباچہ ہے۔

ٹھگوں کا استیصال کرنل ولیم ہنری سلیمن نے کیا۔اس نے مختلف ٹھگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی تنظیم کے بارے میں معلومات اور ان کی مخصوص بولی کے لفظوں کو جمع کیا۔اس کی کتاب 'رماسیانا' ٹھگوں کے متعلق معلومات کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔اس کے کہنے پر علی اکبر الٰہ آبادی نے ٹھگوں کے مصطلحات پر اُردو فارسی میں کتابیں لکھیں۔رشید حسن خاں نے ان کتابوں سے اپنا متن تیار کیا جو 'مصطلحاتِ ٹھگی' کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔''

(سہ ماہی اُردو ادب، اکتوبر، نومبر، دسمبر، 2003 انجمن ترقی اُردو ہند، نئی دہلی، صفحہ 165)

پروفیسر نیر مسعود کے نام رشید حسن خاں نے بہت سے خطوط ارسال کیے۔ان خطوط میں ادبی مسائل پر بالخصوص تحقیق اور تدوین کے پیچیدہ مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔رشید حسن خاں اپنے ادبی کاموں کی ابتدا اور اختتام کی اطلاع اپنے خطوط میں تحریر کرتے تھے۔فسانۂ عجائب، سحرالبیان، گلزارِ نسیم، مثنویاتِ شوق وغیرہ تدوینات کے نسخوں اور ان میں در آئے لفظیات پر طویل قلمی گفتگو بھی ان خطوط میں درج ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ رشید حسن خاں نے نیر مسعود سے شیعہ مسلک کے بہت سے مسائل، رسم و رواج کے تعلق سے بھی خط لکھے ہیں۔لکھنوی زبان اور محاوروں پر بھی ان دونوں ادبی بزرگوں کے درمیان خط و کتابت ہوتی رہی۔نیر مسعود کے نام یکم جنوری 1995 کو لکھے خط میں رشید حسن خاں نے یہ اطلاع دی کہ آج گلزارِ نسیم چھپنے کے لیے چلی گئی ہے۔آخری صفحے کا نمبر شمار 724 ہے اس میں 13 صفحے فارسی متن کے بھی ہیں۔خاں صاحب نے اسی خط میں یہ بھی اطلاع دی کہ انھوں نے آج ہی شام سے مثنویاتِ شوق کا کام شروع کر دیا ہے۔29 مارچ 1995 کو لکھے گئے خط میں رشید حسن خاں نے نیر مسعود سے ''تیغِ حق''، ''ضربِ حیدر سے کانپتے ہیں ملک''، ''نادِ علی''، ''کربلا'' اور ''نوچندی'' کے بارے میں تفصیلات دریافت کیں۔خط کافی طویل ہے اس کا ایک حصہ قارئین کی خدمت میں پیش نظر ہے:

(1) ''تیغ حق نے، (کذا)۔'' تیغ سے اشارہ ذوالفقار کی طرف ہے۔اس کے لیے شیعہ عقیدہ یا خیال کیا ہے؟ دائرۃ المعارف میں تو یہ مرقوم ہے کہ جنگِ احد میں یہ ایک کافر کی تلوار تھی، رسول اللہ کو ملی اور آپ نے حضرت علی کو دے دی۔کیا یہ عقیدہ یا روایت ہے کہ یہ عرش سے اُتری تھی، اِسے حضرت جبریل لائے تھے؟

(2) ''ضربِ حیدر سے کانپتے ہیں ملک۔'' کیا اس میں کوئی تلمیح ہے؟ غالباً دبیر کا شعر ہے:

خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

دو چار سطروں میں اِس کے متعلق لکھیے۔

(3) 'بھولی حیدر کو پھر نہ یادِ علی
آئی جس روز سے کہ 'نادِ علی'

'نادِ علی' کی عبارت کیا ہے، اور تلمیح کیا ہے؟

(4) ''ماسواں کے، کیا یہ اوج ہے کم دوشِ احمد پہ تھے علی کے قدم''

یہ غالباً کعبے میں بتوں کو توڑنے والے سے متعلق ہے، مگر مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ذرا سی تفصیل لکھ دیجیے۔

(5) جب کیا فتح قلعۂ خیبر
تھی یہی ذوالفقار زیبِ کمر

اس کی ذرا سی تفصیل۔

(6) مثنوی میں 'کربلا' بار بار آیا ہے مثلاً:

''دوست جتنے تھے، رہتے تھے ہمراہ
کربلا میں کبھی، کبھی درگاہ''

تاریخ لکھنؤ (کراچی) میں چار پانچ کربلاؤں کا ذکر ہے۔یہ کون سی کربلا ہے جہاں ایسے اجتماعات ہوتے تھے اور درگاہ تو درگاہ حضرت عبّاس مراد ہے نا؛ اِس سے متعلق تاریخِ اودھ' (نجم الغنی) میں تفصیل مرقوم ہے یہ بنی کیسے اور علم کی حقیقت کیا تھی۔

رجب کی اخیر نوچندی سے کیا مراد ہے،نوچندی تو ہر چاند کی پہلی جمعرات کو ہوتی تھی۔کیا رجب کی اخیر نوچندی کس خاص واقعے سے متعلق ہے؟

(8)رہتا تھا تیرھویں کا جلسہ یادشام سے جاتے تھے حسین آباد

''تیرھویں'' سے کیا مراد؟اور کیا اُس دن حسین امام باڑے میں کوئی رات بھر کا جلسہ ہوتا تھا؟

صاحب!میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو زیادہ داخلِ حسنات ہونے کا ایک موقع فراہم کروں۔آپ کو تو ثواب ملے اور مجھے معلومات۔ضمیمۂ تشریحات کے لیے اِن سب کی ضرورت ہے۔'گلزارِنسیم' چھپ گئی۔اس کی ضخامت کی بنا پر ڈاک سے کیا بھیجوں،کسی کے ہاتھ بھیجوں گا،کئی جلدیں بھیجنا ہیں۔انتساب کے لیے کہہ چکا تھا کہ وہ لکھنؤ کے ایک صاحب کے نام ہے۔نام کیا لوں،کوئی اللہ کا بندہ ہوگا۔

جواب جلد

رشید حسن خاں

پروفیسر نیر مسعود نے تاحیات رشید حسن خاں کے علم،ان کے ادبی کارناموں اور کلاسکی ادب کو ازسرِنو تدوین کرنے کے جنون کی ستایش کی۔مثنویاتِ شوق کے حوالے سے جو مضمون پروفیسر نیر مسعود نے سپردِ قلم کیا تھا اس میں بھی انھوں نے رشید حسن خاں کو تحقیقِ اعظم قرار دیا۔الغرض!ان دونوں ادبی بزرگوں نے اپنے اپنے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابلِ تعریف اور لائقِ تقلید ہیں۔صحیح معنوں میں ان جیسے ادب کے متوالوں اور شیدائیوں کی وجہ سے ہی اُردو ادب کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔میں نے اس مختصر سے جائزے میں پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے علمی و ادبی تعلقات کا تجزیہ اور محاکمہ پیش کرنے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔میرا ماننا ہے کہ اس ضمن میں،نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے تعلقات کے حوالے سے کام نہیں ہوا ہے۔اُمید کرتا ہوں کہ نیر مسعود اور رشید حسن خاں کے ادبی نظریات کے اختلاف کے باوجود ان دونوں مایہ ناز ادبی شخصیتوں نے ایک دوسرے کے وقار،افتخار اور احترام میں کوئی کمی بیشی نہیں آنے دی۔دونوں کا یہ ماننا تھا کہ معاملہ ادبی ہے اسے ادبی سطح پر ہی نپٹانا چاہیے۔جب ادبی معاملات میں ذاتی دخل شامل ہو جاتی ہے تو تعلقات میں خلش پیدا ہو جاتی ہے اور بدگمانیاں ایک دوسرے کا مقدر بن جاتی ہیں۔لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ پروفیسر نیر مسعود اور رشید حسن خاں نے اپنی سوجھ بوجھ،دوراندیشی اور حکمت عملی سے ایک دوسرے کو خطوط لکھ کر اپنی غلط فہمیوں کا ازالہ کر لیا تھا۔

ابراہیم افسر

سِوال خاص،ضلع میرٹھ(یوپی)

5جولائی2019

عمیر منظر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو
مولانا آزاد نیشنل اُردو یونی ورسٹی، لکھنؤ کیمپس

نیر مسعود کی دانش و بینش
(مکاتیب کے حوالے سے)

پروفیسر نیر مسعود

(1936-2017) اردو/ فارسی زبان و داب کے ادا شناس، تحقیقی و تخلیقی ادب کے پارکھ اوراس سے عملی سروکار رکھنے والے ادیب تھے۔ کلاسیکی ادبیات کا انتخاب، ترجمہ نگاری، ادب اطفال کی سرگرمی کے علاوہ اقبالیات، مرثیہ کی تاریخ، تہذیب، روایت اور متن پر استادانہ نگارہ رکھتے تھے۔ نیر مسعود کو بہت کچھ اس روایت سے حاصل ہوا تھا، جسے ادبستان کہا جاتا ہے، نیز ادب کے تئیں ان کی اپنی توجہ اور کوشش سے کسی کو کیا انکار ہوسکتا ہے۔ ایک فکشن نگار کے طور پر ان کو شہرت و مقبولیت حاصل تھی، مگر ادبیات کے مطالعے میں ان کے تحقیقی شغف کا ایک زمانہ قائل تھا۔ رجب علی بیگ سرور پر نیر مسعود کے تحقیقی کام کی ستائش تو اردو دنیا نے کی ہے، وہ ایک بہت عمدہ تحقیقی اور اپنی نوعیت کا منفرد کام ہے۔ اس کے علاوہ بھی نیر مسعود کے کارناموں کی ایک طویل فہرست ہے۔

نیر مسعود کی تحریروں نے اردو نثر کو علمی نثر کی روایت سے ہم آہنگ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ان کی ایک اہم خوبی وہ علمی استفادہ ہے، جو محققین اور دانشوروں نے ان سے اٹھایا ہے۔ اس کا خاطر خواہ اندازہ رشید حسن خاں کے مندرجہ ذیل جملوں سے لگایا جاسکتا ہے:

''نیر مسعود صاحب نے مثنویات کے کئی اہم نسخے بلا تکلف میرے پاس بھیج دیے اور خطوں کے جواب پابندی سے لکھتے رہے۔''

(مثنویات شوق۔ مرتب رشید حسن خاں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) 1988۔ ص، 164)

رشید حسن خاں مذکورہ کتاب کے مقدمے میں نیر مسعود کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

''ان مثنویوں میں کئی مقامات پر ایسی کچھ باتیں مذکور ہیں جن کا تعلق شیعہ عقائد یا روایات سے ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شاعر مذہباً شیعہ تھا۔ میں نے محض از راہِ احتیاط ایسے مقامات کی وضاحت کے سلسلے میں یہ مناسب بل کہ ضروری خیال کیا کہ کسی راسخ العقیدہ شیعہ سے معلومات حاصل کروں۔ ... میرے حلقۂ متعلقین میں نیر مسعود صاحب اس لحاظ سے بھی متعارف حیثیت رکھتے ہیں۔ میں ایسے مقامات کے متعلق ان سے دریافت کرتا رہا اور ضمیمۂ تشریحات میں انھی کے خطوں کی متعلقہ عبارتوں کو درج کر دیا ہے۔'' (ایضاً۔ ص، 162-163)

نیر مسعود کے خطوط کے علاوہ دیگر ادبی شخصیات خصوصاً رشید حسن خاں کے مکاتیب سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔ ان مکاتیب سے پروفیسر نیر مسعود کی باریک بیں نگاہ کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ نیر مسعود کے خطوط میں اردو/ فارسی کتابوں کا ذکر بہت ہے۔ کتابوں سے متعلق بہت سی بحثیں ہیں۔ یہ مباحث ادبی، تحقیقی اور لفظ و معنی سے متعلق ہیں۔ نیر مسعود سے استفادہ کی ایک عمدہ شکل ان کے مکاتیب ہیں۔ ان میں حالات حاضرہ اور ادبی سیاست پر تبصرہ بھی موجود ہے، مگر اپنے خاص انداز میں کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ قاضی عبدالودود کے نام ایک خط (سن ندارد) میں وہ رشک کے نفس اللغہ کے بارے میں یہ اطلاع دیتے ہیں:

رشک کے نفس اللغہ کا وہ مخطوطہ جو میر انیس کے خاندان میں تھا۔ اب پاکستان میں نمودار ہوا ہے۔ جن صاحب کے پاس یہ موجود ہے ان کا کہنا ہے کہ غالبًا یہ مخطوطہ رشک نے نظر ثانی کے لیے میر انیس کو دیا تھا اور میر انیس نے اس میں بعض الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ آپ نے اپنے ایک خط میں نفس اللغہ کی تعریف کی تھی اس وجہ سے مجھے اس لغت میں دلچسپی ہے۔ (سہ ماہی فیضان ادب اپریل تا دسمبر 2018، ص 397)

گیان چند جین اور نیر مسعود کے درمیان مراسلت کا بیشتر عنوان ادبی و تحقیقی معاملات و مسائل ہیں۔ گیان چند کے جین کے نام ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فسانہ عجائب کے قدیم نسخوں سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ نیر مسعود نے ان کے خط کا بہت تفصیلی جواب دیا۔ ایک دوسرے خط میں وہ گیان چند جین کو لکھتے ہیں:

’’ماہنامہ شاعر میں آپ کا مضمون اردو کے ہم صوت حروف پسند آیا، لسانیات اور صوتیات کے موضوع پر بیشتر مضامین اصطلاحوں کی وجہ سے ٹھیک سے میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن آپ کے مضمون سے میرا سا عام قاری بھی مستفید ہوسکتا ہے۔(ایضاً ص:403)

’’سہ ماہی فیضان ادب‘‘ نے نیر مسعود پر ایک ضخیم خصوصی شمارہ شائع کیا ہے۔اس میں نیر مسعود کے ادبی کارناموں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس خصوصی اشاعت میں نیر مسعود کے مکاتیب بھی شامل ہیں،ان کے تقریباً 17 خطوط شائع کیے گئے ہیں۔جو ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر نثار احمد فاروقی، قاضی عبدالودود، مخمور سعیدی، کرشن موہن، پروفیسر گیان چند جین، احمد ہمیش، اسلم پرویز، ٹی آر رینا، جوگیندر پال، مظہر امام اور نامی انصاری وغیرہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ان مکاتیب سے نیر مسعود کی ادبی سنجیدگی، علمی شغف اور دوسروں کے کام آنے کے جذبے کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان کے انداز واسلوب کی متانت بھی قابل رشک ہے۔نیر مسعود کے نام رشید حسن خاں کے خطوط کے مطالعے سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ رشید حسن خاں جیسے محقق و مدون کے نزدیک ان کو کس قدر اعتبار حاصل تھا۔رشید حسن خاں نے نیر مسعود کو 1991 سے 2003 کے دوران 57 خط لکھے ہیں۔خطوط سے تحقیق وتدوین کی ایک بوطیقا مرتب کی جاسکتی ہے، نیز یہ بھی کہ نیر مسعود سے رشید حسن خاں شوخی اور بے باکی کی حد تک گفتگو کر لیتے ہیں۔نیر مسعود کے نام رشید حسن کے خطوط میں ’گلزار نسیم‘ کے بعض اشعار کی تعبیر وتشریح سے متعلق لفظی مباحث پر استفسار ہے۔

جب بکاولی حوض میں پھول نہیں پاتی تو برہم ہوتی ہے، اس وقت:

لرزاں تھی زمیں دیکھ کہرام

تھی سبزے سے راست موبراندام

دوسرے مصرعے میں ’تھی‘ بھی پڑھ سکتے ہیں اور ’تھے‘ بھی یعنی یوں بھی:

تھے سبزے سے راست موبر اندام

اور ’تھی‘ کی صورت میں زمین مبتدا ہوگئی۔نسخہ چکبست ونسخہ قاضی عبدالودود میں ’تھی‘ ہے۔آپ کی رائے میں مرجح صورت کیا ہے۔(رشید حسن خاں کے خطوط، ڈاکٹر ٹی آر رینا(مرتب)،2011 ص:981)

اسی طرح 1995 کے ایک خط میں رشید حسن خاں نیر مسعود صاحب سے استفسار کرتے ہیں:

بہار عشق میں ایک شعر ہے:

قبضۂ مرتضی علی کی قسم

اسی اللہ کے ولی کی قسم

ایک صاحب نے بتایا کہ پہلے کبھی یہ قسم بھی کھائی جاتی تھی اور ’’قبضہ سے مراد قبضۂ ذوالفقار ہے۔کیا ایسی کوئی قسم تھی؟ ’’قبضہ‘ کے ایک معنیٰ ’’بازو‘‘ بھی لکھے ہیں۔(حوالہ بالا ص:996)

ایک اور خط میں استفسار کی یہ شکل دیکھیں:

نوج اس طرح بھی کوئی گھبرائے

نج کوئی اتنی ہول مچائے

میرا خیال یہ ہے کہ ’نج‘ اسی ’’نوج‘‘ کی مخفف شکل ہے۔ذرا بیگمات سے پوچھیے تو کہ کبھی یہ لفظ کانوں میں پڑا ہے؟ آپ کی خوش دامن صاحبہ شاید بہتر طور پر بتا سکیں۔نور میں یہ موجود نہیں۔(ایضاً ص:999)

اسی طرح لفظ ’’صحنک سے متعلق سوال وجواب کو دیکھا جاسکتا ہے۔رشید حسن خاں نے 7/اگست 1995 کو ایک خط میں نیر مسعود سے پوچھا کہ:

’’صحنک‘‘ کا لفظ ایک جگہ آیا ہے۔اس سے تو میں واقف ہوں، لیکن بس یونہی سا۔میں نے یہ سنا تھا کہ مرد اس میں شرکت نہیں کر سکتے... میں نے کہیں پڑھا تھا کہ زردہ بھی بعض جگہ ہوتا ہے۔یعنی صرف زردہ (پلاؤ والا زردہ۔(۲) کیا زنانہ صحنک میں صرف ’سیدانیاں‘ شریک ہوسکتی ہیں کیا دوسری عورتیں پاک دامن ہونے کے باوصف شریک نہیں ہوسکتیں؟ (۳) پاک دامن ہونا شرط ہے یا بن بیاہی ہونا بھی شرط ہے۔آپ کی بیگم صاحبہ نے کبھی صحنک میں شرکت کی ہے۔مطلب یہ ہے کہ حیطہ تصرف میں آنے سے پہلے۔اب ان بیچاری کو اتنی مہلت کہاں ملتی ہوگی۔انھوں نے کیا دیکھا ہے، نیاز کا کھانا اور شرکا کے سلسلے میں۔(حوالہ بالا ص:999-998)

اس کا جواب خط کی شکل میں نیر مسعود صاحب نے دیا تھا۔وہ خط تو نہیں مل سکا مگر رشید حسن خاں نے مثنویات شوق میں اپنے اس استفسار کے ذکر کے بعد نیر مسعود کا جواب تحریر کیا

''صحنک'' میں دہی، چاول، شکر کا رواج زیادہ ہے، لیکن زردہ بھی ہوتا ہے۔ یہ عموماً شادیوں میں دلہن کی گود بھرائی کے موقع پر، ختنے اور گھوڑے چڑھائی (یعنی مختون کے تندرست ہوجانے کے بعد کی رسم) کے موقع پر ہوتی ہے۔ مراد برآنے کے لیے بھی مانی جاتی ہے۔ زنانہ، مردانہ دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ مردانہ صحنک پر رسول خدا، حضرت علی، شہدائے کربلا کی نذر دی جاتی ہے۔ زنانہ صحنک پر جناب سیدہ کی نذر ہوتی ہے۔ یہ بی بی کی صحنک بھی کہلاتی ہے۔ بند کمرے میں ہوتی ہے اور پہلے چھ عورتیں چکھتی ہیں۔ مرد اسے چھو نہیں سکتے، بلکہ اس بند کمرے میں چھوٹا لڑکا تک نہیں جاسکتا۔ ان چھ خواتین کا سیدانی ہونا پہلے ضروری تھا، اب اس شرط کی سختی کے ساتھ پابندی نہیں ہوتی۔ ان خواتین کے چکھنے کے بعد بیاہیاں، بن بیاہیاں، سیدانیاں، غیر سیدانیاں سبھی چکھ سکتی ہیں۔ ان کا پاک ہونا شرط ہے۔ پاک اس معنی میں بھی کہ غسل وغیرہ کی حاجت نہ ہو اور اس معنی میں بھی کہ لباس یا بدن پر کسی قسم کی نجاست نہ ہو۔ پاک دامن ہونا ظاہر ہے کہ ضروری ہے۔ لیکن یہ امر اعتباری ہے اور یہ اعتبار مسلم خواتین کی گھرانوں کو حاصل ہے، یعنی ان کے بارے میں یہ تفتیش نہیں کی جاتی کہ وہ پاک دامن ہیں یا نہیں۔

(مثنویات شوق۔ مرتب رشید حسن خاں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) 1988، ص، 309-310)

اس طرح کی بے شمار مثالیں نیر مسعود کے نام خطوط میں موجود ہیں۔ ان سے رشید حسن کے تحقیقی شغف اور نیر مسعود کی بے مثال ادب دوستی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ نیر مسعود کو ایک خط میں انھوں نے تحقیق سے متعلق اپنے تجربہ کو اس طرح لکھا ہے کہ وہ محقق کے لیے کلیدی حیثیت کی حامل قرار دی جاسکتی ہے:

میرا تجربہ یہ ہے کہ باغ و بہار، فسانہ عجائب، گلزار نسیم اور اب یہ مثنویاں، ان سب کے نتیجے میں کہ لگن سچی ہو اور آدمی پوچھنے میں شرم نہ کرے اچھے طالب علم کی طرح، اور یہ کہ صبر کی توفیق رفیق رہے تو پھر ہر نسخہ مل جاتا ہے اور ہر کام ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز ملی نہیں اس میں کم تو جہی کو دخل ہوتا ہے یا پھر اس کو کہ طلب صادق نہیں ہوتی اور آدمی کام کو جلد تر کرنا بل کہ بھگتانا چاہتا ہے۔ میں نے باغ و بہار کے سلسلے میں ہندی مینول کی تلاش میں مکمل بیس سال تک صبر کیا اور تلاش کرتا رہا آخر کو مل گیا، جبکہ سب کو اس کا یقین آچکا تھا کہ وہ ناپید ہو چکا ہے۔'' (ایضاً ص:997)

نیر مسعود کے نام ان خطوط میں مثنویات شوق کے اولین نسخے کی تلاش وجستجو کی پوری داستان موجود ہے۔ نیر مسعود، اسلم محمود، شمس الرحمٰن فاروقی، عقیل رضوی اور اسلم پرویز سب لوگ اس جستجو میں شریک ہیں مگر رشید حسن خاں کے ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروفیسر نیر مسعود کو ان کے یہاں کس قدر اعتبار حاصل تھا۔ 20 جنوری 1995 رشید حسن خاں نیر مسعود کو لکھتے ہیں:

دیکھیے نیر صاحب! یہ بات بنے گی اس طرح اور نہ چلے اس طرح، نسخے آپ کو حاصل کرنا ہیں، جس طرح بھی ہو، طریقہ کار آپ جانیں۔ لیکن مجھے وہ نسخے ہر طور پر ملنا چاہیے۔ (ایضاص:982)

نیر مسعود صاحب صاحب کے یہاں اس طرح کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ ان کے مکاتیب سے یقیناً علم و دانش کی روایت کو فروغ ملا ہے اور ان کی اہمیت دو چند ہوتی جائے گی۔ آخر میں نیر مسعود کے اس خط کا ذکر کیا جارہا ہے جسے تدریسی سیاست کے ضمن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

لکھنو یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کی ایک جگہ تھی اور گیان چند جین کے دل میں یہ خواہش تھی کہ ان کا اس جگہ پر تقرر ہو جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نیر صاحب کو خط لکھا ہوگا کیونکہ نیر صاحب کے خط کے مندرجات سے یہی واضح ہورہا ہے۔ نیز یہ بھی کہ گیان چند جین کو کچھ اندیشے بھی تھے ورنہ نیر مسعود خط کے آخر میں یہ نہ لکھتے کہ تقرر کے لیے سارے امیدوار اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں لیکن، آپ کے حق میں فیصلہ ہوجانے کے بعد Unwelcome ہونے کا سوال نہیں، (فیضان ادب ص:400) نیر مسعود 13 جنوری 1975 کے خط میں گیان چند جین کو لکھتے ہیں:

''شعبۂ اردو کی پروفیسر شپ کا فیصلہ اسی تعلیمی سال میں ہو جائے گا۔ آپ کو یہ خیال کیوں کر گزرا کہ اردو فارسی شعبوں کے اساتذہ کو آپ کا درخواست دینا ناگوار گزرا ہے؟ اس وقت شعبۂ فارسی میں ڈاکٹر ولی الحق انصاری اور میں لیکچرر ہیں، ڈاکٹر رغیب حسین صاحب ریڈر اور صدر، شعبۂ اردو میں شبیہ الحسن صاحب انتظامی تقرر کے تحت ریڈر اور صدر ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صاحب (جو غالباً دو سال میں سبکدوش ہو جائیں گے) اور ملک زادہ منظور احمد صاحب لیکچرر ہیں۔ سلیمان حسین اور شکیل احمد صاحبان عارضی لیکچرر۔ پروفیسر شپ کے مقامی امیدواروں میں صرف شبیہ الحسن صاحب ہیں جن کے متعلق مجھے علم ہے کہ جوڑ توڑ کے آدمی نہیں بلکہ بہت سلجھا ہوا مزاج رکھتے ہیں، وہ اپنے لیے کوشاں تو ضرور ہو سکتے ہیں لیکن حصول مقصد کے لیے آپ کی مخالف میں کسی کارروائی کی ان سے امید نہیں ہے۔ (سہ ماہی فیضان ادب، مئوناتھ بھنجن، اپریل تا دسمبر 2018 ص:399)

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے ''رقص شرر'' میں لکھنو یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔ اس سے شعبہ کی پوری فضا سامنے آجاتی ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے پروفیسر شپ کے مذکورہ واقعہ کا ذکر بھی اپنے خاص انداز میں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کرنے کا خیال پیدا ہوا اور وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس مرحلے سے گزر جائیں تا کہ ہاشمی صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا مستقبل روشن اور تابناک ہو جائے ۔ وہ ریڈر کے عہدہ پر فائز تھے اور ان کی ترقی کے ساتھ ساتھ میرا مستقبل بھی وابستہ تھا۔ مگر جب وقت آیا تو ان کے مد مقابل پروفیسر گیان چند جین آ گئے جو اپنے علمی اکتسابات میں ان سے کہیں آ گے تھے مگر اس مرحلے کو سید شبیہ الحسن نے نہایت عزم اور حوصلے کے ساتھ طے کیا اور ایسا داؤں مارا کہ گیان چند جین چاروں خانے چت ہو گئے اور شبیہ الحسن پروفیسر ہو کر صدر شعبہ کے عہدہ پر فائز ہو گئے ۔'' (رقص شرر، ملک زادہ منظور احمد ص:358)

نیر مسعود صاحب نے وقیع علمی و ادبی کارنامے دیے۔ تحقیق و ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایک فکشن نگار کے طور پر ان کی ایک منفرد شناخت ہے۔ البتہ اس دوران جب ان کے مکاتیب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو ایک خوش گوار حیرت کا احساس ہوتا ہے کہ یہاں بھی علم و ادب کی ایک دنیا آباد ہے۔ نیر مسعود کے خطوط کی تحقیق و تدوین یقیناً علم و ادب کا ایک اہم کام ثابت ہوگا۔ جہاں زندگی علم و ادب کے پیرائے میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ اور یہ بھی دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک محقق کس طرح چیزوں کو تلاش کرتا ہے اور آخر وقت تک ہمت نہیں ہارتا۔ نیر مسعود کے توسط سے علم و دانش کی ایک دنیا آباد تھی ۔ اس دنیا کو محدود دائرے میں نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ مکاتیب نیر مسعود کے تعلق سے اگر چہ یہ ابتدائی مطالعہ کہا جائے گا لیکن بسا اوقات ابتدائی کوششیں ہی بڑے کام کا پیش خیمہ بھی بن جاتی ہیں۔

☆☆☆

نیر مسعود

رشید حسن خاں: چند جھلکیاں

،اس کی خبر نہیں۔ بات یہ ہے کہ اب جی نہیں لگتا۔ کبھی کبھی تو سارا کاروبار فضول ہونے لگتا ہے اور ساری بحث ''غریب اکبر کی پردے کی بحث'' معلوم ہوتی ہے اچھے اچھے اساتذہ بے ایمانی اور دُنیاداری میں لگے ہوئے ہیں اور ان کے شاگرد بھی اُستاد کے نقشِ قدم پر چلنا سیکھ رہے ہیں۔ ایسے میں اصول وضوابط کی کسی کو ضرورت نہیں۔ اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ لکھنے کے متعدد ی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس احساس کے ساتھ کوئی مربوط کام کیسے ہوگا؟''

v v v

''دیکھیے صاحب! میرا اصل میدان تھا ٹریڈ یونین کا کام۔ زندگی کے چھ سات سال اس کی نذر کیے۔ یہ سلسلہ 1946 میں ٹوٹ گیا۔ دوسرا ذوق تھا اسپورٹس کا، ہاکی، فٹ بال، والی بال ٹیبل ٹینس اور باسکٹ بال۔ 15، 20 سال خود بھی ہاکی کھیلی ہے۔ اب آج کل میرا زیادہ وقت اسی کھیل کود کی نذر ہو جاتا ہے۔

مزاجِ من از حالِ طفلی نہ گشت

...اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح وقت کو صرف کرنا چاہیے تھا۔''

v v v

''صاحب! میں تو دعا گو ہوں اور جو کچھ ملے اس پر شکر گزار، لہٰذا میری ناخوشی یا ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا پٹھان اب شیخ جی بن چکا ہے۔''

v v v

''...جلسہ سات بجے ہے۔ اگر آپ کچھ پہلے آجائیں تو خوب ہو...خدا جانے کیسے کیسے ہونقوں کا وہاں دیدار ہوگا اور کون کون غلام صورت بقّال سیرت براجمان ہوگا! ابھی سے گھبرا رہا ہوں...شام کو ذرا جلد جائیے گا۔ میر صاحب کے صفرا اور بنیے کے ساتھ والی حکایت تو یاد ہوگی! وہی حال ہوگا وہاں۔''

v v v

''سچی بات تو یہ ہے اس متن نے مجھے تھکا مارا ہے۔ اس قدر صبر آزما کام سے کام سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں یار لوگوں نے کس طرح اب تک اسے نپٹایا ہے اور اساتذہ نے پڑھایا ہے۔''

v v v

''تحریک کے خاص نمبر میں ''غیر معتبر حوالے'' کے عنوان سے میرا ایک مضمون چھپا ہے۔ کیا آپ کی نظر سے گزرا۔''

v v v

''ہاں برادر! 8/ جولائی کو (7:45 بجے سے 8:15 بجے شام) ایک تقریر ہے ''ادب کا مقصد اخلاقی قدروں کا فروغ''۔ میں نے اپنی بات کہی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اُسے آپ ضرور سُن لیں۔ میں نے عنوان کے آگے سوالیہ نشان بنالیا ہے۔ اور اسی کی تشریح کی ہے کہ یہ سب چوتیاپے کی باتیں ہیں۔''

(مکاتیبِ رشید حسن خاں بہ نام نیّر مسعود)

''بھئی رشید حسن خاں سے ضرور ملنا ہے''، میں نے شمس الرحمٰن فاروقی سے کہا۔ وہ بولے۔''ہاں ہاں چلیے۔ میری بھی عرصے سے ملاقات نہیں ہو پائی ہے۔''

دہلی یونی ورسٹی کے گائر ہال میں کئی غلط کمروں پر دستک دینے کے بعد آخر ایک دانائے راز نے صحیح کمرے کی نشان دہی کی۔ دستک دی گئی۔ کمرے کے اندر سے جواب ملا۔ اور ہم لوگوں کو اطمینان ہوا کہ نئی دہلی سے پُرانی دہلی کی لمبی دوڑ بے کار نہیں گئی۔

v v v

بیس پچیس برس پہلے مرحوم اختر تلہری میرے والد صاحب سے ملنے آئے تو ان کے ساتھ ایک سنجیدہ صورت جوان بھی تھے۔ بعد میں والد صاحب نے بتایا کہ ان صاحب کا نام رشید حسن خاں ہے۔ پھر انھوں نے ان کی لیاقت اور ذہن کی رسائی کی تعریف کی اور ادبی قحط الرجال میں انھیں ایک استثنا قرار دیا۔ اس طرح رشید حسن خاں کا نام میرے ذہن میں پڑا رہ گیا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کی تحریریں نظر سے گزرتی رہیں۔

بعض کتابوں کے متعلق سُننے میں آیا کہ یہ دراصل رشید حسن خاں کا ثمرہ ہیں۔ اگرچہ ان کتابوں مرتب یا مولف کی حیثیت سے ان کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ پھر علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کی پہلی جلد پر اُن کے طویل تبصرے کا غلغلہ ہوا اور یہاں تک مشہور ہوا کہ اس تبصرے کی وجہ سے تاریخ ادب کا وہ پورا منصوبہ ہی ختم ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ایک احتسابی نقاد اور محقق کی حیثیت سے رشید حسن خاں کی شہرت ہو گئی۔ اور اسی کے ساتھ یہ اندیشہ بھی پیدا ہوا کہ اب ان کا قلم نکتہ چینی ہی کے میدان میں دوڑ سکے گا۔ لیکن ''اُردو املا'' جیسی ضخیم تصنیف پیش کر کے انھوں نے اس اندیشے کو دور کر دیا۔

78ء تک رشید حسن سے میری کوئی خاص واقف کاری نہیں تھی البتہ 75ء میں انھوں نے والد محترم کی تعزیت میں مجھے خط لکھا تھا اور 77ء میں جب وہ کسی کام سے لکھنؤ

آئے تو زبانی تعزیت کے لیے میرے مکان پر بھی آئے تھے لیکن میں موجود نہیں تھا اس لیے ملاقات نہیں ہو سکی۔ 78ء میں انھوں نے مجھے رجب علی بیگ سرورؔ کی کتاب ''سرورِ سلطانی'' جو توکّل بیگ حسینی کے خلاصۂ شاہنامہ ''شمشیر خانی'' کا ترجمہ ہے، اس کی طلب میں خط لکھا۔ رشید حسن خاں غالباً اس زمانے میں میں ''شمشیر خانی'' کو مرتب کرنے کا ارادہ کر رہے تھے اس سلسلے میں اُن سے میری خط و کتابت ہوئی۔ پھر انھوں نے مجھے اطلاع دی کہ وہ رجب علی بیگ سرورؔ کی داستان ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین کر رہے ہیں اور اس کتاب کے بعض لفظوں کے متعلق دریافت کیا کہ اہلِ لکھنؤ انھیں کس طرح بولتے ہیں۔ اس دوران انھوں نے مجھے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق، مسائل اور تجزیہ'' بھیجی۔ میں نے کتاب پڑھ کر ان کا شکریہ ادا کیا اور انھوں نے جواب میں شکریہ ادا کیا کہ میں نے کتاب پڑھی:

''اُردو کے (مجھ جیسے) مصنف کی مشکل یہ نہیں کہ کتاب چھپ تو جاتی ہے، کسی طرح سہی، مثلاً یہی کتاب چھپ گئی (بس یہ ہوا کہ ناشر نے معاوضہ نہیں دیا، ایک نیا پیسہ بھی نہیں، چھاپنے کی شرط ہی یہ تھی) لیکن اس کی سب سے بڑی مشکل ہے پڑھنے والے کی تلاش۔ دانش گاہوں میں مشکل سے چار فی صد یا تین فی صد اساتذہ ایسے ہوں گے جو مطالعہ فرماتے ہیں، باقی سب ترقی کے بجّے کرتے رہتے ہیں۔ ایسے قحط کے عالم میں جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص نے کتاب پڑھی ہے تو کس قدر مسرت ہوتی ہے، اس کو صحیح طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ آپ نے کتاب پڑھی اس کا شکریہ.... ناشر سے طے یہ ہوا تھا کہ وہ معاوضے کے بدلے کچھ جلدیں گے اور انھوں اپنا وعدہ وفا کیا۔ میں نے یہ کیا کہ ان سب جلدوں کو ایسے لوگوں کے نام روانہ کر دیا جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ اس طرح کی تحریروں کو پڑھتے ہیں اور سمجھتے ہیں۔''

ان سطروں میں مجھے وہی ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی والی کیفیت محسوس ہوئی جو رشید حسن خاں کے بیش تر مضامین میں محسوس ہوئی تھی۔ ان مضامین نے میرے ذہن ایک آزردہ اور برافروختہ نقاد کا نقش بنایا تھا۔ ان کے چبھتے ہوئے تنقیدی جملوں کی زہر آلودگی مجھے دل چسپ معلوم ہوئی تھی۔ لیکن اس اندازِ تحریر کی وجہ سے یہ خیال ہوتا تھا کہ ان کی شخصیت زیادہ خوش گوار نہ ہوگی۔ ''فسانۂ عجائب'' کے سلسلے کی خط و کتابت آگے بڑھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اُردو میں پہلی بار نثری متن کی تدوین کا حق ادا ہو رہا ہے۔ ہر دوسرے خط میں رشید حسن خاں سرورؔ کی چیرہ دستیوں کی شکایت کرتے (''صاحب اس متن نے تو مجھے ناچ نچا دیا'') لیکن ساتھ ہی فسانۂ عجائب کے کسی لاینحل مقام کے حل ہو جانے کا مژدہ بھی دیتے۔ غرض ایسا معلوم ہوتا کہ دن رات مرزا رجب علی بیگ اور رشید حسن خاں میں جنگ ہو رہی ہے جس میں کبھی مرزا کے لیے مغفور غالب رہتے ہیں، کبھی خان موصوف، اور یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ آخر مرزا صاحب کو میدان چھوڑنا پڑے گا۔ خطوں میں اس محاذِ جنگ کی تازہ ترین خبروں کے علاوہ رشید حسن خاں خود بھی بہ تدریج نشر ہو رہے تھے جس سے خیال ہونے لگا کہ وہ دل چسپ آدمی ہیں۔ اور میں نے سوچا کہ ان سے ملنا چاہیے چناں چہ 1980 کی گرمیوں میں دہلی جانے سے پہلے میں نے انھیں خط لکھ دیا کہ دہلی آ رہا ہوں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے یہاں قیام ہوگا اور آپ سے بھی ملاقات کروں گا۔

v v v

کمرا حسبِ توقع ویسا ہی تھا جیسا رشید حسن خاں کے کمرے کو ہونا چاہیے، یعنی کتابوں سے بھرا ہوا، خود رشید حسن خاں البتہ خلافِ توقع کچھ بزرگ نما نظر آئے۔ لیکن کسی بھی شخص سے لمبے عرصے کے بعد دیکھیے تو سب سے پہلے اس پر جمی ہوئی ماہ و سال کی گرد نظر آتی ہے جو ذرا دیر میں چھٹ جاتی ہے۔ مزاج پُرسیوں کے بعد اِدھر اُدھر کی گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے ''فسانۂ عجائب'' کی پیش رفت کے بارے میں دریافت کیا۔

''جی ہاں! کام ہو رہا ہے۔'' انھوں نے بے دلی سے جواب دیا تھا۔ اور موضوع بدل دیا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر انھیں ''فسانۂ عجائب'' کی راہ پر لانا چاہا۔ اور انھوں نے پھر سرسری جواب دے کر کوئی اور ذکر چھیڑ دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس گفتگو سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ یہ ادائیں تو پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی ہوتی ہیں۔ اتنے میں فاروقی صاحب نے کسی سلسلے میں میرا نام لیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔ رشید حسن خاں چونک کر بولے: ''اچھا آپ نیّر صاحب ہیں؟'' فاروقی صاحب نے قہقہہ لگایا اور میں نے پوچھا ''میرا خط آپ کو نہیں ملا؟''

''نہیں، ارے بھائی آپ سے تو بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ خوب، کب آئے؟ صاحب اس فسانۂ عجائب نے تو...''

لیکن اس دن ''فسانۂ عجائب'' کے بارے میں زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔ طے ہوا کہ خاں صاحب فاروقی صاحب کے یہاں آئیں گے اور وہاں تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

مقررہ دن مقررہ وقت سے خاصی دیر کے بعد خاں صاحب تشریف لائے۔ سبب یہ تھا کہ انھیں کالونی کا نام تو یاد تھا لیکن فاروقی صاحب کے مکان نمبر کا خیال نہیں رہا تھا گویا حوالے میں کتاب کا نام تھا صفحہ نمبر غائب تھا۔

''پھر آپ یہاں کس طرح پہنچے؟'' میں نے پوچھا ''اتنی بڑی کالونی میں کوئی مکان تلاش کرنا...؟

''بھائی ہر کالونی میں ایک مارکیٹ ضرور ہوتی ہے۔ بس میں سیدھا مارکیٹ پہنچا۔ وہاں جنرل مرچینٹ کی دکان پر بیٹھے ہوئے سردار جی سے ترقی اُردو بورڈ کے ڈائرکٹر فاروقی صاحب کا مکان پوچھا۔ انھوں نے کھٹ سے بتا دیا کہ پچاسی نمبر ہے۔'' اس طرح ان کی تحقیقی مہارت کام آ گئی کہ انھوں نے مستند ماخذ تک پہنچ کر معتبر حوالہ

ڈھونڈ نکالا۔

فاروقی صاحب معذرت کر کے دفتر چلے گئے تو ہم لوگوں نے فسانۂ عجائب چھیڑا۔ ''بھائی متن مکمل کر چکا ہوں۔ کاتب کو سامنے بٹھا کر کتابت کرا رہا ہوں۔'' رشید حسن خاں نے چند کتابت شدہ صفحے دکھائے۔ آفسیٹ کتابت میں اعراب اور علامتِ اوقاف سے درست عبارتیں دیکھ کر آنکھیں روشن ہوئیں۔

''اساس نسخہ آپ نے کسے قرار دیا۔'' ''افضل المطابع کان پور کا 1276ھ والا اڈیشن۔''

''لیکن وہ تو متداول اڈیشن سے خاصا مختلف ہے۔ منشی نول کشور نے 'فسانۂ عجائب' کا حقِ اشاعت خرید کر جو اڈیشن 1282ھ میں...''

''جی ہاں! متداول اڈیشن تو اسی پر مبنی ہیں۔ لیکن نول کشوری اڈیشن دراصل 'فسانۂ عجائب' کی اولین اشاعتوں کے مطابق ہے۔ سرور عرصے تک اس کتاب میں رد و بدل کرتے رہے۔ اسی متن اصولاً اس کو ہونا چاہیے جس میں مصنف نے آخری بار رد و بدل کیا ہو۔ اور وہ یہی 1276ھ والے اڈیشن کا متن ہے۔ مگر بھائی، پوچھیے مت اس متن کی تیاری میں کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں۔''

میں نے انھیں متن کے معرکہ سر کر لینے کی مبارک باد دی اور اس پر خوشی ظاہر کی کہ متن کی کتابت بھی نہایت صحت کے ساتھ ہو رہی ہے۔ چند ماہ بعد پٹنہ کے ایک سمینار میں رشید حسن خاں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اُن کی اور ''فسانۂ عجائب'' کی خیریت دریافت کی تو بولے:

''ارے صاحب عجب حادثہ گزرا۔ سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔''

مجھے خیال ہوا کہ شاید کتابت شدہ اوراق تک بارش کی سیلن پہنچ گئی۔ لیکن خاں صاحب نے بتایا کہ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں انھیں اسی افضل المطابع کا چھپا ہوا ''فسانۂ عجائب'' کا ایک بعد کا اڈیشن ملا ہے۔ ''اور اس میں ظالم نے بہت سی تبدیلیاں کر دی ہیں۔''

''انا للّٰہ ! پھر؟''

''ساری کتابت اور محنت بے کار ہو گئی۔ اب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نئے سرے سے متن تیار کیجیے اور کتابت کرائیے۔ اس لیے کہ اساسی متن اصولاً اس کو ہونا چاہیے جس میں مصنف نے آخری بار رد و بدل...''

''درست... خدا کرے جب اس متن کو تیار کر کے آپ کتابت مکمل کرا لیں تو ''فسانۂ عجائب'' کا ایک اڈیشن اس کے بھی بعد دست یاب ہو جس میں سرور نے ایک بار پھر رد و بدل...''

''ارے صاحب ایسی بد دُعا نہ دیجیے... کیا بتاؤں اس دریافت سے جو کوفت ہوئی ہے، لیکن خوشی بھی ہوئی ہے۔ اگر کتاب چھپنے کے بعد یہ اڈیشن دریافت ہوتا تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ پٹنہ آنے کا یہ بڑا فائدہ ہوا۔'' پٹنہ کا وہ سمینار محمود شیرانی کی یاد میں اور تحقیق کے مسائل پر تھا۔ سمینار میں ایک مقالہ پڑھا جا رہا تھا۔ رشید حسن خاں نے ایک پرچے پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس پر کچھ لکھ کر ان کی طرف اور انھوں نے کچھ لکھ کر پھر میری طرف بڑھا دیا۔ جو صاحب مقالہ پڑھ رہے تھے انھوں نے تھوڑا اُرک کر تشویش بھری نظروں سے نامہ و پیام کی اس کاروائی کو دیکھا اور پھر مقالہ پڑھنے لگے۔ انھیں شاید یہ خیال ہوا کہ ان کے مقالے پر کوئی زبردست اعتراض وارد ہونے والا ہے۔ لیکن دراصل خاں صاحب نے اس پرچے پر اپنے محقق دوست کی شان میں ایک نیم فحش رباعی موزوں کر کے مجھ سے داد طلب کی تھی۔

سمینار کے ایک وقفے میں انھوں نے مجھ سے کہا: ''بھئی عمدہ چائے کو جی چاہ رہا ہے۔ چلیے شہر کے کسی اچھے ہوٹل میں چل کر چائے پی جائے۔'' ''مگر معلوم نہیں اس اچھے ہوٹل میں چائے بھی اچھی ملے گی یا نہیں۔''

''ضرور ملے گی صاحب، رہبری کے لیے فرشتۂ رحمت موجود ہے۔'' تب میری نظر قریب کھڑے فرشتۂ رحمت پر پڑی۔ خاں صاحب نے معلوم نہیں کیوں کہاں سے ایک خوب رو نوجوان ڈھونڈھ نکالا تھا۔ یہ نوجوان ہمیں ایک صاف ستھرے ہوٹل میں لے گیا۔ چائے آئی۔ اس وقت سمینار کے اس اجلاس پر گفتگو ہو رہی تھی جس میں ایک مقالے پر اعتراض کرتے ہوئے رشید حسن خاں نے کہا تھا کہ صوفیانہ مزاج تحقیق کے لیے مضر ہے۔ اس کا مطلب بعضوں نے یہ نکالا کہ وہ عمومی حیثیت سے تصوف پر معترض ہیں۔ میں نے اعتراض کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ تحقیق کی بنیاد شک پر ہوتی ہے اور تصوف کی بنیاد یقین پر۔ تحقیقی مسائل کے حل کے لیے وہی مزاج زیادہ سود مند ہے جو... وغیرہ وغیرہ۔

ہم سمینار ہال کی طرف واپس جا رہے تھے کہ دیکھا آگے آگے کچھ فاصلے پر پروفیسر سید حسن صاحب بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔ سید صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور انھوں نے اُس دن سمینار میں شرکت سے معذوری ظاہر کر کے ہم لوگوں کو گھر پر آنے کی دعوت دی تھی۔

''دیکھیے بالکل خیال نہیں رہا۔'' رشید حسن خاں نے سید صاحب پر نظر پڑتے ہی کہا۔ سوچا تھا واپسی میں سید صاحب کے یہاں چلیں گے۔ بڑی محبت سے بلایا تھا انھوں نے۔''

''لیکن وہ تو یہاں آ گئے ہیں گھر پر ملتے ہی کب؟'' میں نے کہا اور خاں صاحب کے ذہن میں ایک تازہ مضمون آ گیا۔ ''دیکھیے برادر اس وقت دو بج کر دس منٹ ہوئے ہیں سید صاحب یہاں آنے کے کوئی پندرہ منٹ پہلے گھر سے چلے ہوں گے۔ یعنی دو بجے سے کچھ پہلے۔ اور ہم لوگ دو بجے اُن کے یہاں پہنچے تھے۔ ٹھیک۔''

’’ٹھیک‘‘ میں نے کہا۔ کچھ دیر باہر رُک کر ہم ہال میں داخل ہوئے اور سید صاحب کو دیکھ کر چونک پڑے۔

’’قبلہ آپ یہاں ہیں؟‘‘ رشید حسن خاں نے شکایتی لہجے میں کہا ’’اور ہم لوگ سمینار چھوڑ کر آپ کے یہاں حاضر ہوئے تھے۔‘‘

’’ہیں، ارے کب؟‘‘

’’آپ ہی کے یہاں سے آ رہے ہیں صاحب۔ ہم لوگ دو بجے پہنچے تو معلوم ہوا...؟

’’دو بجے، ہائے! بس تھوڑی دیر پہلے میں گھر سے نکلا ہوں گا۔‘‘

’’جی ہاں، یہی معلوم ہوا کہ آپ ابھی ابھی تشریف لے گئے ہیں۔‘‘

سید صاحب دیر تک متاسف اور شرمندہ رہے۔ لوگ یکے بعد دیگرے اُن کی مزاج پُرسی اور سمینار میں تشریف آوری پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور وہ ہر ایک کے جواب میں ہم لوگوں کی طرف اشارہ کر کے یہ ضرور کہتے:

’’دیکھیے یہ بے چارے مجھ سے ملنے میرے گھر گئے لیکن میں یہاں چلا آیا۔‘‘

پروفیسر نذیر احمد صاحب کا مقالہ تحقیق میں مستند اور غیر مستند شہادت کے مسئلے پر تھا۔ رشید حسن خاں کو خیال آیا اس سلسلے میں سید صاحب کے یہاں ہم لوگوں کی حاضری کے مسئلے کو بحث کا موضوع بنایا جائے۔ ظاہر ہے سید صاحب اور ان کے حوالے سے بہت سے دوسرے مستند حضرات یہ شہادت دیں گے کہ آج دو نیاز مند سید صاحب کے گھر گئے تھے۔ لیکن کافی غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ اس مسئلے کو نہ چھیڑا جائے۔

اُتر پردیش اُردو اکاڈمی کی جنرل کونسل میں نامزدگی اور اکاڈمی کی کچھ سب کمیٹیوں کی رکنیت کے بعد سے رشید حسن خاں کی لکھنؤ آنے کا اکثر موقع ملتا ہے۔ جنرل کونسل کے اجلاس (اپریل 1981) میں ان کی شرکت کا خاصا چرچا تھا اور توقع تھی کہ وہ اجلاس میں بھی سخت گیر نقاد کے فرائض بحسنِ وجوہ انجام دیں گے اور انھوں نے حسبِ توفیق اس توقع کو پورا بھی کیا۔ اسی اجلاس میں کونسل کے ایک رُکن نے خاں صاحب کو اپنی تازہ تصنیف پیش کی۔ جسے انھوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے، ان کی نظر انتساب کے صفحہ پر پڑ گئی۔ کتاب اُردو کے ایک نقاد کے نام معنون تھی جو خاں صاحب کے معیارِ حسن پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ انھوں نے فوراً قلم نکال کر نقاد کے نام پر خط کھینچا۔ لکھا ’’خدا غلام بنائے، غلام صورت نہ بنائے۔‘‘ اور کتاب میری طرف بڑھا دی۔ مصنفِ کتاب میری برابر والی کرسی پر بیٹھے تھے اور اگرچہ میں نے کتاب فوراً بند کر دی لیکن تاثراتی تنقید کے اس قول فیصل پر ان کی نظر پڑ ہی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے خاں صاحب سے سرگوشی میں کہا:

’’آپ نے غضب کر دیا، انھوں نے پڑھ لیا۔‘‘

’’یہی تو میں چاہتا تھا۔‘‘ خاں صاحب نے بڑی آسودہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کے بعد انھوں نے سرگوشی میں دورِ حاضر کے ادبی کاروبار پر ایک ہوش افزا اور ہوش ربا تقریر کی اور الحمدللہ کہ جوش میں آنے کے باوجود ان کی آواز بلند نہیں ہونے پائی اور مجمعِ سامعین کے فرائض میں تنہا انجام دیتا رہا۔ رشید حسن خاں کی احتسابی تنقید میں جو التہاب و اشتعال نظر آتا ہے وہ دراصل اسی تقریر کے چند نسبتاً کمزور اور دوستانہ فقروں کی بدولت ہے۔ تقریر میں انھوں نے نام بہ نام کئی مشاہیر ادب کے کارنامے بیان کیے جنھیں سن کر حیرت ہوئی کہ اپنی خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی موجود ہیں۔ یہ رشید حسن خاں کی محبوب تقریر ہے جو صرف بے تکلف صحبتوں کے لیے مخصوص ہے۔ تقریر میں ان مشاہیر کا تذکرہ تمام کرنے کے بعد وہ اپنی تحقیق و تنقید کا خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:

’’میں ان سب کو حرام زدگانِ ادب کہتا ہوں۔‘‘

اور سننے والوں کو بھی ان غریبوں کی ولدیت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔

v v v

اسی موقع پر رشید حسن خاں میرے گھر تشریف لائے۔ آتے ہی انھوں نے میری چھوٹی بچی صائمہ سے دوستی کر لی اور بچی بھی فوراً ان سے مانوس ہو گئی۔ اس سے دیر تک باتیں کرنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ میں نے احتجاج کیا تو بولے: ’’آپ براہِ کرم اس معاملے میں دخل نہ دیں یہ کوئی تحقیقی مسئلہ نہیں۔ میرا اور صائمہ کا حساب کتاب ہے۔‘‘ اس کے بعد سے وہ تقریباً ہر خط میں صائمہ کو ضرور یاد کرتے ہیں۔

’’ارے بھئی آپ کہاں تھیں۔ ہم اتنی دیر سے آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آیئے ہمارے پاس بیٹھیے، یہ بات ہوئی۔ ہاں تو برادر فسانۂ عجائب کا متن تین سو صفحوں میں آیا ہے اور ملحقات چار سو صفحوں میں۔ اس صورت میں...‘‘

(اظہار 5 (پانچویں کتاب جنوری 1984 ممبئی) ناشرین باقر مہدی اور یعقوب راہی، صفحہ 53 تا 63)

(ادبستان، شخصی خاکے، نیر مسعود صفحہ 5 تا 17، پہلی اشاعت 2006، ناشر آصف فرخی، ادارہ شہرزاد، بی 155 بلاک 5، گلشنِ اقبال، کراچی)

کیا ہو۔ کیوں کہ رسالہ اظہار میں اس تحریر کو جنوری 1984 میں شامل کیا گیا تھا۔ ''ادبستان'' میں یہ مضمون ''رشید حسن خاں'' عنوان سے شامل ہے جب کہ ''رسالہ اظہار'' میں ''رشید حسن خاں: چند جھلکیاں'' کے عنوان سے شامل ہے۔ مرتب۔

☆☆☆

نیّر مسعود

رشید حسن خاں کی تنقیدی تحریریں

ستمبر 1970 کی میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون ''دُہرے کردار کی پرچھائیں'' (سطور، دہلی) میں رشید حسن خاں نے اُردو تنقید کے انشائیہ اسلوب کی پُرفریبی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چوں کہ یہ ڈر بھی رہتا ہے کہ اس اسلوب پر اعتراض بھی کیا جا سکتا ہے، اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ تنقید کو خشک اور غیر دل چسپ بے آب و گیاہ ریگستان بنانے کے بجائے دل چسپ بنایا گیا ہے۔ اور یہ ''تخلیقی تنقید ہے...... یہ انشائیہ طرزِ نگارش ایک طرح کی متعدّی بیماری ہے جو نئے ذہنوں کو روگ بن کر لگتی رہتی ہے..... پسی ہوئی بجلیاں، دُھلی ہوئی چاندنی..... غرض اس طرح کی نامعلوم کتنی پُرفریب ادائیں صرف کی جاتی ہیں۔ اور تنقید کو داغؔ کی شوخ بیانی کا مرقع بنا کے رکھ دیا جاتا ہے۔ تنقید کی صاف گوئی اور سادہ بیانی ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔''

اس مضمون کی اشاعت سے بیس سال پہلے مئی 1950 میں رشید حسن خاں کا پہلا مضمون ''شبلی کا فارسی تغزل'' شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں بھی ان کی تحریری اسلوب یہ تھا۔

''شبلی کے تغزل میں شراب جیسا سکر اور نشے جیسی مسحور کُن ربودگی ہے...... پورے کلام میں چڑھتے ہوئے نشے اور بڑھتے ہوئے جوش و ولولہ کا تیز احساس ملتا ہے..... شبلی کے یہاں سوز و گداز اور گداختگی و برزشتگی نہیں بل کہ بجائے اس کے ایک بھرپور سُر ہے اور ایک سیّال ارتعاش۔''

آگے بڑھ کر شبلی کے کچھ شعر نقل کیے گئے تھے جن میں یہ شعر بھی تھا:

غمگیں مباش گر سخن از مدّعا نہ رفت
شبلی ہنوز اوّلِ رازِ دنیا ز بود

(اگر مطلب کی بات نہیں ہوئی تو غم مت کر۔ اے شبلی ابھی تو راز و نیاز کی ابتدا تھی)

اور ان شعروں پر مجموعی تبصرہ اس طرح کیا گیا تھا:

''ان تمام اشعار میں جذباتیت بے قراں کی فراوانی ہے۔''

یہ اُٹھان اچھی نہیں تھی۔شعر میں تیز سُکر ،مسحور کُن ربودگی ،چڑھتا ہوا نشہ ،بڑھتا ہوا جوش و ولولہ ،بھرپور سُر اور سیّال ارتعاش وغیرہ موہوم اوصاف تلاش کرنا ''سوز'' کے ساتھ ''برزشگی'' اور ''گداز'' کے ساتھ ''گداختگی'' کا استعمال ضروری سمجھنا ،سیدھے سادھے اور جذباتیت سے تقریباً عاری۔شعریں جذباتیت کی فراوانی ہی نہیں ''بے کراں فراوانی'' ڈھونڈھ نکالنا پُرفریب انشائیہ نگاری اور تنقید کے دفتر بے معنی ہیں اضافے کے سوا کچھ نہیں تھا۔یہ مضمون نیاز فتح پوری کے ''نگار'' میں شائع ہوا تھا۔اور کسی نومشق مصنف کے مضمون کا نگار میں شائع ہو جانا اسے اپنے متعلق مغالطے میں ڈالنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔لیکن رشید حسن خاں کو غالباً خود بھی جلدی احساس ہو گیا کہ شعر کی تعریفی تنقید ان کا میدان نہیں ہے۔

اس کے بعد وہ ادبی افق پر ایک معترض نقاد کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔اور ان کی تحریروں نے پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔

مئی 1954 کے تحریک (دہلی) میں رشید حسن خاں نے فیضؔ کے مجموعے کا تنقیدی جائزہ لیا (''دستِ صبا پر ایک نظر'') اسی جائزہ میں انھوں نے پہلے کلام فیضؔ سے چند نمونے پیش کر ان کی تعریف کی۔جس کا انداز یہ تھا:

''کیا اچھا انداز بیان ہے''

''زور بیان کے اعتبار سے یہ دو شعر قابل داد ہیں۔''

''زور بیان و حسن تشبیہ قابل داد ہے۔''

اس کے بعد انھوں نے فیضؔ کی شاعری پر بعض وزنی اعتراض کیے:

> ''ان کے یہاں بالعموم دو ایسی خامیاں ملتی ہیں۔جنھوں نے معیار و حسنِ ادا کے اعتبار سے اس مجموعے کو نا قابل اعتنا بنا یا دیا ہے۔اور اچھی نظموں کو بھی مجموعی طور پر حسن سے محروم کر دیا ہے۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ان میں قدم قدم پر زبان و بیان کی ایسی فاش غلطیاں ملتی ہیں جن سے سارا حسن خاک میں مل جاتا ہے۔نیز استعارہ اور تشبیہ اور صفتی الفاظ کے انتخاب میں جگہ جگہ ایسی بدعتیں سامنے آتی ہیں جس سے نظم کے صوتی تناسب اور حسن ہیئت کا سلسلہ ایک دم ختم ہو جاتا ہے.....دوسری خامی یہ ہے کہ آخر نظم تک زور بیان اور حسنِ تناسب یکساں قائم نہیں رہتا۔ایک بند نہایت بلند اور دوسرا نہایت پست۔ایک شعر بہت اچھا ہے اور دوسرا بُرا۔اسی طرح پوری نظم تناسب سے محروم ہو جاتی ہے۔یہ ایسی خامی ہے جس سے کوئی نظم کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔''

فیضؔ کے یہاں زبان اور اس سے زیادہ بیان کی غلطیوں کی جو مثالیں رشید حسن خاں نے پیش کی ہیں۔ان کی روشنی میں فیضؔ کی قادرالکلامی بہت مشکوک نظر آنے لگتی ہے۔

مثلاً فیضؔ کا مصرعہ ہے:

جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ

رشید حسن خاں کا اعتراض یہ ہے:

> ''بے نور دماغ کا جی اُٹھنا محل نظر ہے۔اجڑنے کا متضاد بسنا ہے اور بے نور کا منوّر۔اگر کہا جاتا کہ تیرا بے نور دماغ منوّر ہو جائے یا تیرا اجڑا ہوا دماغ آباد ہو جائے تو ایک بات ہو سکتی تھی۔''

یا فیضؔ کے مصرعے

یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں

پر یہ اعتراض کیا ہے:

> ''اس.....میں دو مختلف المعنی لفظ بہ ترکیب عطفی آئے ہیں، اس لیے تناسبِ کلام اس کا متقاضی ہے کہ اختر و کوکب میں سے ایک لفظ خارج کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا مختلف المعنی لفظ لایا جائے۔کیوں کہ اختر و کوکب مرادف ہیں۔''

''دستِ صبا'' پر اس تبصرے کے عرصے بعد رشید حسن خاں نے فیض کے متعلق ایک اور مضمون ''فیض اور اس کی شاعری'' لکھا۔(بحران۔جودھ پور 1977) اس مضمون میں زیادہ تفصیل سے فیضؔ کی شاعری پر اعتراض کیے ہیں۔

اعتراض اصولی طور پر وہی جو دست صبا پر تھے۔لیکن اس مضمون میں خاص بات یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے فیضؔ کی ادبی شہرت اور مقبولیت کے غیر ادبی اسباب اور ان اسباب کے دوررس نتائج کا بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔مثلاً:

ایک محدود لیکن با ذوق حلقے میں ان کی بعض نظموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔لیکن اس کے بعد وہ ''مجاہد شاعر'' بن گئے اور اسی زمانے سے سیاسی حلقوں نے (ملک کے اندر اور ملک کے باہر ہر جگہ) مختلف سطحوں پر اپنے اپنے انداز سے ان کی ''مجاہدانہ شہرت'' کے لیے راہیں ہموار ہوگئیں۔ان کے کلام کو ان ہی اثرات کی روشنی میں دیکھا گیا۔اور اسی کی فرمائش کی گئی۔اس کے نتیجے میں یہ ہونا چاہیے تھا کہ شاعری کی بحث میں اضافی خوبیوں کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل رہے۔۔شاعر کو اگر مجاہد کی حیثیت سے دیکھا جائے تو پھر اس کی ہر تحریر کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ ''لگا دی ہے خون دل کی کشید۔

چوں کہ ان کو مجاہد کا منصب بخش دیا گیا اس لیے اُن کی ہر بات آیت وحدیث ہو کر رہ گئی......ان کی کمزور سے کمزور نظم کو اُردو کی اعلا تخلیق بتایا گیا اور اس آوازہ گری میں معقول وغیر معقول سبھی لوگ ہم آواز ہو گئے۔اگر کبھی کسی نے زبان یا بیان کے کسی پہلو کی طرف توجہ دلائی تو اس کو لفظ پرست روایت پرست اور رجعت پرستوں کی بات کیوں سنی جائے۔اس صورتِ حال کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ زبان و بیان پر گفتگو کرنا گھٹیا درجے کا کام قرار پایا۔اس غلط اندیشی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ان شاعروں کو جن کو ضرورت تھی صحیح مشوروں کی۔اس محرومی نے غلط گوئی کو بڑھاوا دیا اور شاعری معائب سے بوجھل ہو کر اپنے ظاہری حسن کو کھو بیٹھی۔''

ان مضمونوں کے علاوہ رشید حسن خاں نے کئی مضمون اور لکھے جن میں انھوں نے ترقی پسند شاعروں کے یہاں فنی اسقام کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندوں کے نظریۂ ادب اور ترقی پسند تنقید کے طریق کار سے سخت اختلاف کیا ان مضمونوں کے کچھ اقتباس جو اس سلسلے میں ان کے خیالات کی نمایندگی کرتے ہیں بلا تبصرہ پیش کیے جاتے ہیں:

''دوسرے لوگوں کی طرح نقاد کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس نظریۂ حیات پر چاہے ایمان رکھے اور اس کا اظہار کرے۔لیکن عالم نقد ونظر میں اس کی حیثیت صرف ادبی نقاد کی ہونا چاہیے۔ہم ایک باظرف خوش ذوق اور دیانت دار ناقد سے یہ توقع کرتے ہیں کہ ادب میں وہ اپنے معتقدات کی جستجو یا اپنے پسندیدہ اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اس ادب پارے کا درجہ متعین کرنے کے بجائے صرف اس بات کو دیکھے گا کہ ادبی حیثیت سے اس کا مرتبہ کیا ہے۔''

(تنقیدی جانبداری کے اسباب اور اثرات ''نقوش'' لاہور)

''تنقید میں جن عناصر نے جانب داری کی تشکیل کی ہے ان میں بنیادی عنصر ادب اور نظریے کا باہمی تعلق ہے۔ایک دبستان میں نظریہ ادب کے لیے لازمی حیثیت رکھتا ہے......نظریے میں قطعیت ہوتی ہے کہ اس کو ماننے کے بعد آپ مجبور ہیں کہ دوسرے نظریات کی نفی کریں۔نظریے کو اگر ادب کی بنیاد بنایا جائے تو ادب میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔اس طرح وہ عام، مشترک، ہمہ گیر، آفاقی و کائناتی تصورات جو سارے انسانوں میں جو قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں ادب ان سے معرا ہو جائے گا اور وقتی طور پر صرف ایک طبقہ کی جذباتی تسکین کا فرض انجام دے سکے گا۔ادب کا جائزہ ان اخلاقی، انسانی اور تہذیبی اصولوں کے تحت لیا جا سکتا کہ چوں کہ فلاں ادیب نے فلاں بات کہی ہے جو اس نظریے کے خلاف ہے اس لیے وہ بات اور اس کی ادبی حیثیت، دونوں ناقابل التفات ہیں۔''

(ایضاً)

''ادھر کے پندرہ بیس برسوں میں ناقدین نے ہیئت کے تجربوں، ادب وسماج کے باہمی تعلق اور اس کے تجزیے پر اس حد تک زور دیا کہ حُسنِ بیان، فصاحتِ کلام اور معانی و بیان کے بے حد ضروری قاعدوں کو نظر انداز کر دینا باشعور شاعر کے لیے ضروری سا ہو کر رہ گیا....بہت سے نئے شاعروں نے صرف ہیئت کے تجربوں اور سماجیت کو سب کچھ فرض کر کے شاعری کو حُسنِ بیان اور تاثیر سے معرا بنانے کی کامیاب کوشش کی، اور اس بات کو فراموش کر دیا کہ صرف لفظ پرستی یوں محض خیال بندی، دونوں باتیں دلیل کم نظری ہیں۔''

(زبان و بیان کے بعض پہلو، نقوش لاہور، جولائی 1962)

''ترقی پسند تحریک نے جن مصلحت آمیز اصولوں کو تخلیقی ادب کی بنیاد قرار دیا، اور جن کی پابندی لازمی قرار دی گئی ان کے نتیجے میں ایک طویل گروہ ان شعرا کا نظر آتا ہے جن کی صلاحیتِ شاعرانہ کو ان غیر فطری اور شاعرانہ اصولوں کی پابندی سے بے حد نقصان پہنچا۔اگر بہ غور دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس غیر شاعرانہ عمل کی ساری ذمہ داری ان اصول ونظریات پر ہے جن کی پابندی نے یہ گل کھلائے ہیں۔''

(غزل اور ترقی پسندی، نیا دور لکھنؤ، اگست 1955)

تخلیقی ادب کی تنقید میں پریشانی کی بات یہ ہے کہ نقاد اور ادیب کے بیچ میں پڑھنے والے کی ذاتی پسند اور ناپسند حائل رہتی ہے۔نقاد کی رائے سے پڑھنے والا خفیف سا (وہ بھی وقتی طور پر) متاثر ہوسکتا ہے۔لیکن یہ ممکن نہیں کہ پڑھنے کو کوئی تخلیقی تحریر محض نقاد کے کہنے پر اچھی سے بُری یا بُری سے اچھی معلوم ہونے لگے...

ذوق کے مقابلے میں جیت ذوق ہی کی ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادب کو جس زمانے میں قاری کا ذوق پسند کرتا تھا اس زمانے میں ترقی پسندی پر اعتراضی تنقیدیں اسے سہارا نہ دے سکیں۔ رشید حسن خاں کی یہ تنقیدیں بھی ترقی پسندی کے عروج وزوال پر کوئی خاص اثر مرتب نہ کر سکیں۔ لیکن ان تنقیدوں میں جس طرح قاعدے کی باتیں قاعدے کے ساتھ کہی گئی تھیں اس کی وجہ سے موافقوں اور مخالفوں دونوں کی نگاہ میں رشید حسن خاں کو ایک معتبر ادبی شخصیت کی حاصل ہوگئی۔ اس شخصیت کو مزید استحکام ان تحریروں سے ملا جن میں رشید حسن خاں نے تخلیقی ادب کے بجائے تحقیقی تحریروں کو اپنی تنقید کا موضوع بنایا۔

تخلیقی ادب اور تحقیقی تحریر کی تنقیدوں کا فرق ظاہر ہے۔ تخلیقی ادب کا بنیادی عمل پڑھنے والے کو متاثر کرنا ہوتا ہے۔ تحقیق کا بنیادی عمل اسے حقیقتوں سے واقف کرانا ہوتا ہے۔ تخلیقی ادب کی تنقید کسی فن پارے کے سارے عیب گنوا دینے کے بعد بھی پڑھنے والے کو اس پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اس فن پارے سے متاثر نہ ہو۔ لیکن تنقید اگر کسی تحقیقی تحریر کے بیانات کو خلافِ حقیقت ثابت کرتی ہے تو پڑھنے والا مجبور ہو جاتا ہے کہ اس تحریر سے حاصل ہونے والی معلومات کو اپنے ذہن سے خارج کر کے اس کے عدم اور وجود کو برابر سمجھے۔ رشید حسن خاں نے جب فیضؔ کے یہ اشعار نقل کیے۔

دولتِ لب سے پھرائے خسروِ شیریں دہناں
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

....

پھر وہی جاں بہ لبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

اور دولتِ لب، ارزاں ہو، جاں بہ لبی، لذّتِ مے کو ''غیر مناسب آرائش لفظی کی بدترین مثالیں'' قرار دیا تو وہ سب پڑھنے والوں کو اپنی ہم نوائی پر مجبور نہیں کر سکے۔ لیکن جب ''ثقافتِ پاکستان'' کی متعدد تحقیقی غلطیوں کی نشان دہی کی (تحریک، دہلی، جولائی 1964) تو پڑھنے والے یہ ماننے پر مجبور ہو گئے کہ ''ثقافتِ پاکستان'' قابل اعتبار کتاب نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس میں متعدد تحقیقی غلطیاں موجود ہیں، مثلاً محمد شاہ کا سالِ وفات، سوداؔ کا سالِ وفات، دردؔ اور مومنؔ کے سالِ وفات غلط لکھے گئے ہیں۔ بہت سے اشعار کا متن درست نہیں ہے۔ رائے سرب سکھ دیوانہؔ کو ''منشی سرب سنگھ دیوانہؔ'' لکھا ہے اور کئی کتابوں کے ناموں میں تحریف ہوئی ہے۔ مثلاً ''مآثر الامرا'' اور ''مآثرِ رحمی'' کو معاصر الامراء اور ''معاصر رحمی''، ''نفحات الانس'' کو ''نفحۃ الانس''، ''اُردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام'' کو ''اُردو میں صوفیائے کرام کا حصہ'' لکھا گیا، وغیرہ۔ اس طرح ایک مضمون ''در شہر شما نیز کنند'' (تحریک، دہلی، اپریل 1960) انھون نے دیوانِ خاقانؔی کے ایرانی اڈیشن مرتب علی عبدالرسول کا تنقیدی جائزہ لے کر بتایا کہ دیوانِ خاقانؔی کے نول کشوری اڈیشن کا علی عبدالرسول نے ایرانیوں کے احساس برتری کے تحت حقارت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن خود ان کے مرتب کیے ہوئے اڈیشن میں استنادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔

دیوانِ خاقانؔی اور ''ثقافت پاکستان'' کے علاوہ بھی ''علی گڑھ تاریخ ادب اُردو'' (جلد اوّل) ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی مرتبہ ''اُردو شاعری کا انتخاب''، مالک رام کے مرتبہ دیوان غالبؔ (صدی اڈیشن) اور جمیل جالبی کی ''تاریخِ ادبِ اُردو'' (جلد اوّل پر) رشید حسن خاں کی تنقیدوں سے ایک طرف ان کتابوں کا اعتبار اور وقار کم ہوا۔ دوسری طرف یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ اس وقت رشید حسن خاں ادبی تحقیق کے موثر ترین نقاد ہیں۔ تحقیق کو خشک موضوع سمجھا جاتا ہے، تحقیق کی تنقید اس سے بھی زیادہ خشک چیز ہے۔ جس کی دل چسپی اور افادیت زیادہ تر ناقد، محقق اور موضوعِ تحقیق سے علاقہ مندوں تک محدود رہتی ہے لیکن رشید حسن خاں کی تنقید میں اس تنگ دائرے میں محصور نہیں ہیں، انھیں عام طور پر دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کا مطالعہ میدانِ تحقیق کے نو واردوں کے لیے خصوصاً افادیت سے خالی نہیں ہے۔ دراصل رشید حسن خاں اپنی تنقیدوں کو محض تحقیقی اغلاط کی مشینی نشان دہی تک محدود نہیں رکھتے بل کہ اس نشان دہی میں تحقیق کے بنیادی اصولوں سے محنت کرتے ہیں۔ اُردو میں کاروبارِ تحقیق کی بدعنوانیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور موقع بہ موقع طنزیہ اور عتاب آمیز فقرے بھی چست کر جاتے ہیں۔ ان فقروں نے ان کی تنقید میں ایک جارحانہ انداز پیدا کر دیا ہے، جس نے اسے بوجھل اور بے کیف ہونے سے بچا لیا ہے۔ مثلاً ''ثقافتِ پاکستان'' کا وہ جملہ نقل کرنے کے بعد جس میں دو کتابوں کے غلط نام ''معاصر الامرا اور ''معاصر رحمی'' لکھے گئے ہیں، رشید حسن خاں نے ان ناموں کی براہ راست تصحیح کر دینے کے بجائے یوں لکھتے ہیں:

''یہ بالکل نئی کتابیں معلوم ہوتی ہیں۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزریں۔ البتہ ''مآثر الامرا'' اور ''مآثرِ رحمی'' سے ضرور واقف ہوں۔''

دیوانِ غالبؔ (صدی اڈیشن) کی تنقید کے شروع میں یہ فقرے ملتے ہیں:

''تدوین کے طلبا کے لیے زیرِ بحث نسخۂ دیوانِ غالبؔ کا مطالعہ اس لحاظ سے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات معلوم ہو کہ کسی دیوان کو کس طرح مرتب نہیں کرنا چاہیے........ مفروضات پر تدوین کی بنیاد کس طرح رکھی جا سکتی ہے اور کسی مصنف کے واضح بیانات پر کسی مجہول الاحوال کاتب کے اندازِ نگارش کو کس طرح ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ صدی اڈیشن اس کی بہت اچھی مثال ہے۔''

ایک تنقید میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ حصہ ''عبرت کدہ تدوین'' کی حیثیت رکھتا ہے۔''

علی گڑھ تاریخ ادب اُردو کے اشاریے کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا سب سے زیدہ مضحکہ خیز حصّہ اس کا اشاریہ ہے۔اس قدر جہالت تابی کے ساتھ کسی کتاب کا اشاریہ مرتب نہیں کیا گیا ہوگا۔حیرت ہوتی ہے کہ نظرِ ثانی کرنے والوں نے اس پھوہڑ پن کو کس طرح قبول سمجھا!ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشاریہ مرتب کرنے والے بزرگ نے کسی قاعدے کا لحاظ رکھنا اپنے لیے حرام سمجھا تھا۔جس لفظ کو جہاں چاہا ہے اور جس طرح چاہا ہے،لکھا ہے۔میں اس پشتارۂ اغلاط میں سے دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں۔پورا اشاریہ اسی قسم کی خوش فعلیوں کی جولان گاہ ہے۔''

اسی کتاب کے بارے میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''جب اس کی پہلی جلد چھپ کر آئی تو معلوم ہوا کہ اس کو ادبی تاریخ کے بجائے گناہ گاروں کے نامۂ اعمال کا مجموعہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔''

(تنقید ''تاریخ ادب اُردو'')

کاروبارِ تحقیق کے سلسلے میں رشید حسن خاں نے بہت سی تلخ حقیقتوں کا تلخ لہجے میں اظہار کیا،جس کی بنا پر تحقیقی کام کرنے والوں کے ایک بڑے حلقے میں انھیں ایک ناپسندیدہ اور تشویش ناک عنصر قرار دے دیا گیا۔لیکن جن باتوں پر انھوں نے احتجاج کیا ہے وہ بھی کم ناپسندیدہ اور تشویش ناک نہیں ہے۔مثلاً:

''شہرت سے غلط فائدہ اُٹھانا،آج کل شیوۂ عام بن گیا ہے۔بہت سے متعارف اہلِ قلم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ان کا نام ہی صحت ومعیار کی ضمانت ہے۔نہ محنت کی ضرورت ہے نہ پابندیِ آدابِ تحقیق کی۔جو کچھ قلم سے نکل جائے مستند ہے۔ایسی تحریروں کو پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو میں بھی ابتدائی تحقیق کا بھی رواج نہیں ہوا ہے۔یہ صورتِ حال پریشان کُن ہے،خصوصاً اس وجہ سے کہ اس طرح آسان پسندی کی ایک روایت قائم ہوتی جارہی ہے لوگ مرتب یا مقالہ نگاروں کے نام دیکھ کر اس اعتماد کے ساتھ کتاب خریدتے ہیں کہ ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے غلط معلومات حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہاتھ آجاتا ہے۔''

(تنقید ''ثقافتِ پاکستان)

''متعارف حضرات کی تالیفات نو واردانِ بساطِ تحقیق وتدوین کے لیے مثال ومعیار کی حیثیت رکھتی ہیں اگر انھیں حضرات کی تالیفات کا یہ حال ہے کہ کوئی صفحہ کسی نہ کسی طرح کی غلطی،خامی یا نا تمامی سے خالی نہ ہو،تدوین کے اصولوں کی پابندی کا فقدان نظر آئے۔معمولی معمولی مسائل میں الجھاوے موجود ہوں۔اور اہم امور بے نیازی کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے ہوں،اس صورت میں ایسی تالیفات کے جو اثرات ہوں گے ان کا اندازہ کرنا کچھ مشکل کام نہیں۔کم فرصتی ہمارے اکثر متعارف اساتذہ کا ضمیمہ بن کر رہ گئی ہے اور اس کی وجہ سے اکثر خرابیاں ظہور میں آتی ہیں۔ستم یہ ہے کہ حضرات بہ یک وقت کئی کام اور کئی طرح کے کام انجام دینا چاہتے ہیں۔مگر مجبوری یہ ہے کہ تحقیق میں شرک کی گنجائش نہیں۔اور ''ہزار شیوگی'' اس کو راس نہیں آتی۔''

(تنقید ''دیوانِ غالب،صدی اڈیشن)

''یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتاب بھی مغربی تاریخوں کے انداز ومعیار کو ملحوظ رکھ کر اسی طرز پر مرتب کی گئی ہے۔لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ وہاں اچھے علمی کام کرنے والے بد دیانتی کو جائز نہیں سمجھتے،شاگردوں سے اور اپنے مجبور ماتحتوں سے بے گار نہیں لیتے۔''

(تنقید۔علی گڑھ،تاریخ ادب اُردو)

''ہمارے یہاں ناموں سے مرعوب کرنے کا اچھا خاصا رواج ہے کچھ مشہور افراد کے نام لکھ کر یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ ترتیب وتدوین کے تقاضے بھی پورے ہوگئے اور ہر قسم کی بے احتیاطیوں کے جواز کا منشور بھی ہاتھ آگیا۔یہ کتاب اس کی بہت اچھی مثال ہے۔دو معروف نقاد پروفیسر آل احمد سرور اور جناب مجنوں گورکھ پوری،بالترتیب اس کے ڈائریکٹر،اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں،تنقید میں دونوں حضرات کی جو بھی حیثیت ہو،لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پہلی جلد سراسر تاریخی وتحقیقی خشک بیانیوں کا مجموعہ ہے۔تحقیق میں نہ پسی ہوئی بجلیاں ہوتی ہیں،نہ ڈھلی ڈھلائی چاندی،اس میں اتنی لچک ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کا ذکر ہو یا بیدلؔ کی شاعری کا،ہر موضوع کو کسی فرضی صاحب زادی کو سمجھایا جاسکے۔'' (ایضاً)

تحقیق کے اصولوں اور مختلف مسائل پر رشید حسن خاں نے کئی عمدہ مضمون لکھے ہیں۔ان مضمونوں کو بہت سا مسالہ ان تنقیدوں ہی سے فراہم ہوا ہے۔بل کہ تنقیدی اصولوں اور دیگر متعلقات پر روشنی ڈالنے میں ان مضمونوں سے زیادہ کامیاب ہیں جو مختلف موضوعوں سے خود رشید حسن خاں نے براہ راست تحقیق کے موضوع پر لکھے ہیں۔''اُردو شاعری کا انتخاب'' پر اپنے تنقیدی تبصرے میں انھوں نے وضاحت کی ہے:

''اس تبصرے کا مقصد یہ نہیں کہ اس انتخاب کی خامیوں کو گنایا جائے بل کہ اصل مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ انتخاب بہت مشکل کام ہے۔اس کے ساتھ بہت

سی ذمہ داریاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اچھا انتخاب صرف اچھے اشعار کا مجموعہ نہیں ہوتا، وہ تحقیق اور تدوین کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔ یہاں خوش مذاقی اور شعرفہمی کے ساتھ ساتھ تحقیق اور تدوین کے نہایت مشکل اور صبر آزما اصول کی پابندی بھی لازم ہے اور یہ کہ اگر ان امور کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو کیا خرابیاں پیدا ہوسکتی ہیں ۔اس تبصرے کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔''

اور یہ واقعہ ہے کہ رشید حسن خاں کی یہ تنقیدیں محققوں کی غلطیوں کی گرفت کے لحاظ سے جتنی اہم ہیں اس سے زیادہ اس بنا پر اہم ہیں کہ ان سے تحقیق کے بہت سے اصول واضح اور مسائل حل ہوتے ہیں۔ ان تنقیدوں کے پیش نظر یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اُردو میں رشید حسن خاں نے تحقیق کے سب سے زیادہ پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

تحقیق کی تنقید ادب، خصوصاً کلاسیکی ادب کی تاریخ اور متن دونوں کو بہت وسیع اور ذمہ دارنہ مطالعے کا تقاضہ کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ عروض، قواعد اور املا کے مسائل اور فارسی زبان وادب پر بھی گہری نظر اور تحقیق کے ناقد کے لیے ضروری ہے۔ یعنی اس کے لیے بھی وہ سب شرطیں لازم ہیں جو اچھے محقق کے لیے لازم ہیں۔ رشید حسن خاں ان سب شرطوں کو بہ خوبی پورا کرتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''اُردو املا'' اور ''زبان وقواعد'' کی اشاعت کے بعد انھیں املا اور زبان کے مسائل پر سند کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ ان کا ایک اور بہت اہم کارنامہ (جو غالباً اسی سال منظرِ عام پر آجائے گا) ''فسانۂ عجائب'' کی تدوین ہے۔ اس مضمون کو رشید حسن خاں کی صرف تنقیدی تحریروں تک محدود رکھا گیا ہے ۔اس لیے ان کتابوں پر گفتگو کا یہاں محل نہیں ہے۔ ان کا حوالہ صرف یہ جتانے کے لیے دیا گیا ہے کہ رشید حسن خاں کو اُردو تحقیق میں جن معیار کی طلب ہے اس کا نمونہ وہ خود پیش کرنے پر قادر ہیں۔ اس لیے ان کی اپنی تنقیدوں میں اعتراض اور احتساب کا حق دوسروں سے زیادہ حاصل ہے۔ ان کی اس احتسابی تنقیدوں کو منفی رجحان کا نام دے کر سبک کرنے کی کوشش کی گئی ہیں۔ اوّل تو منفی رجحان کا غیر مفید ہونا ہی محل نظر ہے دوسرے...... تخلیق کے احتساب اور تحقیق کے احتساب میں فرق بھی بہت ہے تخلیق کا سخت ترین احتسابی ناقد خود وقت ہے جو غیر معیاری تخلیقات کو بحث ودلیل کے بغیر محو کردیتا ہے لیکن تحقیق کے مسامحات کی اگر گرفت نہ کی جائے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مسامحات کو ہمیشہ کے لیے مسلمات کی حیثیت حاصل ہوجانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ ان مفروضہ مسلمات کی بنیاد پر آیندہ تحقیق کی جو عمارتیں بلند ہوسکتی ہیں ان کو تعمیر کے ابتدائی مرحلوں ہی میں منہدم کردینا کارِخیر ہے۔ رشید حسن خاں کی تنقیدوں نے یہی کارِخیر انجام دیا ہے۔

(اظہار ر5، ممبئی 1984، باقر مہدی، صفحہ 78 تا 92)

☆☆☆

فسانۂ عجائب'' مرتّبۂ رشید حسن خاں

(ٹیلی ویژن پر گفتگو، پروفیسر نیّر مسعود کا فسانۂ عجائب پر اظہارِ خیال)

کاظم علی خاں: ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب، اس وقت جس کتاب پر ہم گفتگو کررہے ہیں وہ رشید حسن خاں صاحب کی کتاب 'فسانۂ عجائب ہے جو 1990 میں انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی سے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے، جو انجمن کے سکریٹری ہیں، شائع کی ہے۔ اس بات پر مجھے بہت فخر بھی ہے کہ اور مسرت بھی ہے کہ اس کتاب کے بارے میں ایک ایسے شخص سے میں ہم کلام ہوں یعنی ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب آپ، کہ آپ نے رجب علی بیگ سرور کی لائف پر اور ان کے ورکس پر اور اُن کے ادبی کارناموں پر بہت ہی اچھی اور بہت ہی Meaningful ریسرچ اور بہت سی Relevent چیزیں آپ نے بہت عرصہ قبل جب ان پر زیادہ توجہ بھی نہیں دی جاتی تھی، اس وقت پیش کیں۔ اس اعتبار سے کہ یہ 'فسانۂ عجائب' سرور کا شاہ کار ہے اور 1990 میں متعدد اڈیشنوں کے بعد اب یہ Latest ایڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے تو آپ اس کتاب کو، اس ایڈیشن کو، اس کی تدوین کے کام کو جو رشید حسن خاں نے کیا ہے، اس کا Level آپ کی نظر میں کیا ہے۔ اس پر کچھ گفتگو نیّر مسعود صاحب آپ فرمائیں تو ہم شکر گزار ہوں گے۔

نیّر مسعود: کاظم علی خاں صاحب، متن کا جہاں تک تعلق ہے میرا خیال ہے ہم سب اس پر متفق ہیں کہ اُردو نثر کی کوئی کتاب ابھی تک اتنے اہتمام کے ساتھ ایڈٹ نہیں کی گئی تھی، نظم کی حد تک تو دیوانِ غالب......

کاظم علی خاں: جی ہاں، نسخۂ عرشی ہے اور پروفیسر مسعود حسن صاحب کا دیوانِ فائز.......

نیّر مسعود: جی، لیکن اُردو نثر کی کوئی کتاب اور وہ بھی 'فسانۂ عجائب' جو بہت ہی خطرناک اور مشکل کتاب ہے، مشکل اس طرح کہ سرور نے اس کتاب کو ایک بار لکھا، اس کے بعد پھر کسی پبلشر نے فرمائش کی کہ صاحب ہمارے لیے لکھ دیجیے، پھر تیسرے نے کہا کہ ہمارے لیے ایک نسخہ تیار کر دیجیے، سرور نے وہ بدل دیا، بار بار انھوں نے تبدیلیاں کیں۔

کاظم علی خاں: جی۔

نیّر مسعود: اب ان سب تبدیلیوں کا پتا لگانا اور سب سے بڑی پرابلم یہ فیصلہ کرنا کہ ہم ان میں سے کس صورت کو قبول کریں اور صحیح مانیں۔ اس کا رشید حسن خاں صاحب نے یہ طریقہ اختیار کیا جو صحیح ہے کہ جس ایڈیشن میں آخری بار تبدیلیاں کی گئی ہیں، افضل المطابع کا 1280ھ والا ایڈیشن، اس کو انھوں نے اساسی یا بنیادی نسخہ بنایا۔ اس نسخے کے متن کو صحیح پڑھنا اور کاتب سے صحیح لکھوانا، یہ خود بہت بڑا کام تھا۔ یہ کام تو ہو ہی گیا مگر یہاں پر رشید حسن خاں نے اپنا کام ختم نہیں کیا، بل کہ اب اس کتاب میں مقدمہ، اور سات تو ضمیمے ہیں....

کاظم علی خاں: ہاں! ڈاکٹر صاحب اس مسئلے پر بھی بات ابھی، ابتدائی منزل میں ہو جائے۔

نیّر مسعود: ہاں ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: اس کتاب میں ویسے دیباچہ تو ہے خلیق انجم صاحب کا، پھر مقدمہ ہے۔ مقدمہ سو صفحے سے زیادہ، ایک سو چودہ صفحے کا ہے۔ تو اس مقدمے میں انھوں نے جو متن Introduce کرایا ہے 'فسانۂ عجائب' کا، تو یہ مقدمہ اور کتاب کا جو متن ہے اس میں کوریلیشن شپ، کس حد تک ایک دوسرے سے دست و گریبان ہونے کی کیفیت ہے، یہ میں چاہوں گا کہ اس مقدمے کے بارے میں آپ.... ویسے تو انھوں نے مختلف چیزیں، جو مختلف ایڈیشن اس کے ہیں اور جو کام انھوں نے کیا ہے.....

نیّر مسعود.... ہاں! اب وہ لوازم جو ہیں اس کے، تو مقدمے میں پہلے تو یہی بتانا ہوتا ہے کہ کون سا متن ہم نے اختیار کیا اور کیوں۔ کتنی بار کتاب میں تبدیلیاں ہوئیں، اس کے اہم ایڈیشن کون کون سے ہیں۔ غرض مقدمے میں پوری طرح کتاب 'فسانۂ عجائب' سے ہم کو آپ کو واقف کرایا گیا ہے۔ دوسرا حصہ مقدمے کا، وہ بھی بہت اہم ہے۔ اس میں انھوں نے بڑی احتیاط اور توازن سے کام لیا ہے، یعنی مصنف کے حالاتِ زندگی....

کاظم علی خاں: مگر مختصر ہیں، نیّر مسعود صاحب....

نیّر مسعود: ہاں مختصر ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت مختصر ہیں۔ اس لیے کہ آپ نے بھی کام کیا ہے اور حضرات نے بھی۔ مگر یہاں بہت مختصر ہیں۔

نیّر مسعود: جی ہاں وہی میں عرض کر رہا تھا کہ مرتّب متن کا یہ کام نہیں ہے۔ متن کے مرتّب کا کام یہ ہے کہ متن کو صحیح کر کے پیش کرے۔ لکھنے والا کب پیدا ہوا، کہاں مرا، یہ بتانا اس کا کام نہیں ہے۔ آپ نے میرا نام لیا تو میرا تو موضوع ہی، رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے' تھا، اس لیے اسے میں نے تفصیل سے لکھا۔ اصولی بات یہ ہے کہ جب آپ کوئی متن مرتّب کر رہے ہوں اور انشاءاللہ آپ کریں گے تو اسے یاد رکھیں گے کہ مصنف کے حالاتِ زندگی صرف وہ لکھیں گے جن کا تعلق آپ کے متن سے ہو۔ مثال کے طور پر سرور کے حالاتِ زندگی میں ایک بہت اہم واقعہ ان کا کان پور....

کاظم علی خاں:...کان پور کا جانا اور.....

نیّر مسعود:...اور یہ کہ انھوں نے ایک قتل کیا اور اس کے بعد خود بھاگ کے گئے یا سزا میں....

کاظم علی خاں: یا کیا صورت ہوئی، جلاوطنی تھی یا.....

نیّر مسعود: .....اور غالباً اسی جرم میں اُن کے استاد بھی.... جیسا کہ رشید حسن خاں کا خیال ہے تو وہاں جا کر ان کا دل بہت گھبرا گیا اور ان کا دل بہلانے کے لیے حکیم اسد علی نے کہا کہ تم یہ لکھو کتاب 'فسانۂ عجائب' تو اس چیز کا، سرور کے حالاتِ زندگی کے اس حصے کا تعلق 'فسانۂ عجائب' سے بہت گہرا ہے، اس لیے اس پر رشید حسن خاں نے ذرا تفصیل سے بات کی۔ یہ انھوں نے بڑی صحیح اور اصولی......

کاظم علی خاں: اچھا، یہ 'فسانۂ عجائب' کا بنیادی متن، اس کے اوپر ابھی پروفیسر گیان چند جین صاحب کی کتاب اور وہ بہت اہم کتاب آئی ہے 'کھوج' اس میں پورا ایک مقالہ انھوں نے لکھا ہے اور رشید صاحب کا بھی ذکر تھوڑا بہت تو اس میں آ ہی گیا ہے کہ وہ کام کر رہے ہیں اور یہ بہت اچھا کام ہوگا، اس کے چھپنے سے پہلے یہ مقالہ لکھا گیا تھا۔ اگر چہ 'کھوج' بھی ایسی کتاب ہے جس پر گفتگو آئندہ کبھی ہونا چاہیے.....

نیّر مسعود: جی ہاں ضرور۔

کاظم علی خاں: تو انھوں نے بنیادی متن پر گفتگو کی ہے اور ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب نے جو نسخہ پیش کیا ہے اور نور الحسن ہاشمی صاحب کے پاس جو.....

نیّر مسعود: جی ہاں، نسخہ فضل رسول......

نیّر مسعود: کام ہی نہیں لیا اس سے۔

کاظم علی خاں: کام نہیں لیا....

نیّر مسعود: نہیں لیا اور بہت صحیح کیا۔

کاظم علی خاں: اور یہ صحیح کیا ہے کہ اس سے کام نہیں لیا ہے۔

نیّر مسعود: جی ہاں، اس لیے کہ یہ جو بنیادی متن....

کاظم علی خاں: لیکن انھوں نے اصل جو انحصار کیا ہے، جس متن پر....اس میں تو ایک سے زیادہ متن ہیں....لیکن یہ مکمل اور بڑے....یعنی....خلاصہ شدہ تلخیص والے جو متن کہے جاتے ہیں ان پر انھوں نے توجہ نہیں دی۔

نیّر مسعود: نہیں دی۔

کاظم علی خاں: اچھا، اب اصل اڈیٹنگ کا کام جو ہے اس کے بارے میں اگر ہم آپ سے یہ دریافت کریں کہ اڈیٹنگ کی جو کیفیت اس کتاب کی ہے، یعنی مثلاً یہ کہ کتابت کس انداز سے انھوں نے کرائی ہے، اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر مجھے یاد آ رہی ہے کہ ابھی شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ایک تقریر اُردو اکادمی میں کسی جلسے کے موقعے پر، شہنشاہ مرزا کے سلسلے میں داستانوں کے اوپر وہ گفتگو ہو رہی تھی، تو انھوں نے کہا کہ بھئی داستان میں یہ سب کام کرنا پنکچویشن مارکنگ، یہ ٹھیک نہیں ہے اس لیے کہ داستان کو.....

نیّر مسعود: وہ تو انھوں نے اس لیے کہا کہ داستان سنانے سننے والی چیز ہے جس کو......

کاظم علی خاں: Oral Tradition کہتے ہیں.....

نیّر مسعود: مگر یہ کتاب 'فسانۂ عجائب' تو لکھی گئی ہے۔ اگر چہ شروع میں اس کو سرور نے بطور داستان بیان کیا لیکن فوراً بعد ہی وہ اس کو لکھنے کی فکر میں لگ گئے۔ تو اب بہت اہم کام اس کے Punctuation کا تھا۔ پُرانی تحریروں میں ظاہر ہے کاما، فل اسٹاپ، پیرا گراف.....

کاظم علی خاں: ....ہوتا نہیں تھا۔

نیّر مسعود: یہ کچھ نہیں ہوتا، تو رشید حسن خاں نے کوشش کی اور بہت حد تک کامیاب رہے کہ یہ علاماتِ اوقاف جو ہیں، اس طرح لگائیں کہ متن تقریباً اپنی شرح آپ کرتا چلے یہ اس کا اصل معیار ہے اور اس کو انھوں نے ملحوظ بھی رکھا ہے۔ اب اس میں یہ ضرور ہوگا کہ کہیں آپ کو اختلاف بھی ہوگا کہ مثلاً آپ نے یوں لکھا ہے لیکن یہ کاما ہمارے نزدیک یہاں نہیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ وہ بہت ہی....

کاظم علی خاں: جب فقرے میں تھوڑی بہت تبدیلی.....

نیّر مسعود: اچھا اب.....تو یہ کام تو ظاہر ہے بہت محنت کا ہے جس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے کام کیا ہے۔ ہمارے سامنے تو ایک کتاب رکھی ہوئی ہے کاما فل اسٹاپ کے ساتھ۔

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیّر مسعود: اس کے بعد گویا اصل کام

کاظم علی خاں: تعلیقات وحواشی.....

نیّر مسعود: یوں سمجھیے کہ اصل کام ختم ہونے کے بعد اصل کام شروع ہوتا ہے کہ جب یہ کام ختم ہو گیا تو اب اس میں کتنے لفظ ہیں جن کے معنی واضح نہیں ہیں، کتنے لفظ ہیں جن کے معنی بدل گئے ہیں۔

کاظم علی خاں: بہت کوشش کی ہے انھوں نے۔

نیّر مسعود: اور اس کوشش کا تو آپ کو بھی تجربہ ہوگا، مجھ کو بھی ہے.....

کاظم علی خاں: بہت بہت....

نیّر مسعود: اس لیے کہ انھوں نے اپنے تقریباً ہر جاننے والے کو کتنے کتنے خط لکھے ہیں.....

کاظم علی خاں: بہت خط لکھے۔

نیّر مسعود: ان معانی کے سلسلے میں انھوں نے مثلاً راجستھان کے مہاوتوں سے رابطہ قائم کیا۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، اچھی

نیّر مسعود: اس لیے کہ کتاب میں جلوس کے ہاتھیوں کا ذکر آ گیا ہے۔ شیش محل کی ڈومنیوں سے، جناب اور مفتی گنج کی بڑی بوڑھیوں سے، افیمچیوں سے، جواریوں سے، غرض جن جن چیزوں سے متعلق الفاظ کتاب میں آئے ہیں جو لغات میں نہیں...

کاظم علی خاں: شطرنج اور مختلف کھیلوں اور بازیوں کے متعلق انھوں نے صباح الدین عمر صاحب سے جن کے نام یہ کتاب معنون.... یہ تو ہے۔

نیّر مسعود: یہ تو ایک تشریح الفاظ والا ضمیمہ ہو گیا۔

کاظم علی خاں: اس میں تو سات ضمیمے ہیں اور ان ضمیموں میں مختلف....

نیّر مسعود: اچھا، اب اس میں مختلف لوگوں کے نام آئے ہیں، جگہوں کے نام آئے ہیں، مثلاً ''اندراس میں عطر کا حوض چھلکتا رہا'' تو اندراس کیا ہے، اس کا انھوں نے پتا لگایا کہ نصیر الدین حیدر کے زمانے کی عمارت تھی، اب ہے کہ نہیں ہے، مثلاً وہ غدر میں ختم ہو گئی۔ پھر تلفظ اور املا والا ضمیمہ جو ہے۔

کاظم علی خاں: وہ بھی بہت عمدہ ہے۔

نیّر مسعود: یہ ان کا خاص میدان ہے، رشید حسن خاں کا، تو اس میں بھی حیرت خیز محنت کی گئی ہے۔

کاظم علی خاں: اچھا اشاریہ، بہ کثرت اشعار اس میں، کتابت کے متن میں سرور نے کھپا دیے ہیں۔ تو ان اشعار پر بھی انھوں نے کافی تحقیق کی ہے، مختلف دواوین اور کلیات کھنگالے ہیں، اصل دیوان دیکھے ہیں۔ یا کہیں کہیں حسرتؔ موہانی کے انتخاب سے بھی، مجھے خیال ہے کہ انھوں نے کام لیا ہے۔

نیّر مسعود: اس میں بھی.....

کاظم علی خاں: شعر میں بھی بعض جگہ سرورؔ کے یہاں تسامح ہے۔

نیّر مسعود: غلط مصرعے ہیں، جان کے بھی....

کاظم علی خاں: جان کر یا کسی بھی بنا پر، تو انھوں نے اس کی تصحیح کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

نیّر مسعود: مثال کے طور پر کس کا شعر ہے، یہ سرور نے کہیں لکھا، کہیں نہیں لکھا اور کہیں غلط لکھ دیا۔ یہ سب تحقیق کر کے اس کا پتا لگانا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کا ہر ضمیمہ بھی قریب قریب ایک پی ایچ ڈی تھیسس کی اہمیت رکھتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی بالکل۔

نیّر مسعود: ضمیموں کے بعد اب فرہنگیں آتی ہیں۔

کاظم علی خاں: فرہنگیں بھی، ایک فرہنگ، دو فرہنگ.....اچھا اس میں عربی کی بھی عبارات، مثلاً آیات ہیں اور فارسی کی، اس کی اطلاعات ہیں۔ تو یہ بھی حصہ اس کا کافی زبردست ہے۔

نیّر مسعود: کون لفظ کہاں مذکر بولا جاتا ہے، کہاں مونّث بولا جاتا ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں، تذکیر و تانیث کے بھی مباحث۔

نیّر مسعود: لیکن کاظم علی خاں صاحب، ایک چیز کی مجھ کو بڑی کوفت بھی ہے اور بہت ہی ناگواری کی بات بھی ہے وہ.....

کاظم علی خاں: جی۔

نیّر مسعود: کہ اتنے اہتمام اور اتنی محنت سے یہ لکھی گئی اور ایڈیٹنگ کی سب سے اہم چیزوں میں ہے وہ ہے مختلف نسخوں کے اختلاف کا درج کرنا....

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

نیّر مسعود: اختلافِ نسخ کا کام...

کاظم علی خاں: نہیں، کیا تو ہے۔

نیّر مسعود: وہ صرف چودہ صفحے....

کاظم علی خاں: ہاں مختصر ہے اور بڑی باریک کتابت ہے۔

نیّر مسعود: لیکن وہ حصہ صرف بیان لکھنؤ کا ہے۔ چوں کہ کتاب کے صفحات زیادہ ہوئے جا رہے تھے اس لیے اکہتر صفحے چھوڑ دیے گئے۔ پچاسی صفحے کی چیز کا ایک ٹکڑا چودہ صفحے کا، اس بنا پر کہ کچھ صفحے زیادہ ہوئے جا رہے ہیں۔

کاظم علی خاں: ہاں یہ تو پبلیشر کی Budgetry Problem تمام مجبوریاں ہیں۔

نیّر مسعود: دوسری کمی اشاریے کی رہی کہ اشاریہ بھی ان کی محدود بنانا پڑا۔ پھر وہی صفحات....

کاظم علی خاں: جی ہاں۔

کاظم علی خاں: کتاب کے سلسلے میں میرا خیال ہے،ہم لوگ یہ بھی بات کرتے چلیں کہ یہ'فسانۂ عجائب' جولکھنؤ کا کلاسیکی ادب،نثر کا ایک شاہ کار ہے،اس کے ساتھ ساتھ رشید حسن خاں،میرامّن کی'باغ و بہار'پر بھی کام کررہے ہیں اور یہ دو کتابیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں۔تو یہ بھی ایک کام کررہے ہیں وہ۔

نیّر مسعود: جی ہاں۔اچھا ایک چیز کاظم علی خاں صاحب،میں سوچتا ہوں کہ جب اس پر بات ہو رہی تو کہیں سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اصل کتاب کا پڑھ دیا جائے۔اس سے ہمارے ناظرین کو اندازہ ہو کہ یہ کتاب کس قسم کی ہے۔

کاظم علی خاں: جی ہاں!ضرور۔

نیّر مسعود: اور کوئی حصہ اُن کی فرہنگ وغیرہ کے دو تین لفظوں کا کہ کس طرح....

کاظم علی خاں: جی ہاں،جی ہاں۔

نیّر مسعود: تو یہاں سے لیا جائے۔

''اب پانچ چار روز سے ہمارے طالع بیدار،جاگتے جاگتے دفعتاً سو گئے۔ایک ساحر مکار،جھاکار،یہ زور سحر اُس محل سے اٹھا لے گیا۔داغ فرقت دے گیا۔ہنوز یہ جملۂ غم ناتمام تھا کہ جانِ عالم کا کام تمام ہوا۔آہِ سرد کھینچ کر بہ حال خستہ و پریشان مثال قالب بے جان زمین پر گر کے بہ حسرت و یاس پکارا۔شعر:

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
حیف ہے اس سے ملاقات نہ ہونے پائی

اب یہ مشکل زبان ہے لیکن اتنی سہولت سے جو میں پڑھ رہا ہوں،اس کا خاص سبب یہ ہے کہ....

کاظم علی خاں: پنکچویشنس۔

نیّر مسعود: ہاں ان کی وجہ سے پڑھنے میں کوئی خاص دقّت نہیں ہوتی،ورنہ روانی سے...

کاظم علی خاں : ہاں اس روانی سے واقعی پڑھنا اس کتاب کا جو نہایت....

نیّر مسعود : اچھا اب یہ تلفظ اور املا کے سلسلے میں دریغ ہی کا لفظ موجود ہے۔''دریغ:فارسی لغات میں اسے بہ کسر اوّل و دوم'دریغ' لکھا لکھا گیا ہے۔فرہنگِ آصفیہ میں یہ لفظ موجود ہے لیکن حرکات کی صراحت نہیں کی گئی،البتہ نور اللغات میں اسے فارسی کے مطابق'بہ کسر اوّل و دوم' ہی لکھا گیا ہے...''

اسی طرح فرہنگ میں جتنے بھی لوازم ہیں تقریباً سب جمع کر دیے ہیں۔

کاظم علی خاں: بڑی محنت کی بڑی محنت ہے۔

(لکھنؤ دوردرشن سے 7/جون 1990 کونشر)

(مشمولہ'رشید حسن خاں کچھ یادیں کچھ جائزے،،ناشر،مکتبہ الحرادربھنگہ بہار،2008،صفحہ 277 تا284)

☆☆☆

نیر مسعود

فسانۂ عجائب: مرتبہ رشید حسن خاں

آخر ''فسانۂ عجائب'' مرتبہ رشید حسن خاں منظر عام پر آ گئی۔ اس اڈیشن کی تکمیل اور اشاعت کے درمیان کئی برس کا فاصلہ ہے۔ کچھ یہی صورت اصل کتاب ''فسانۂ عجائب کے ساتھ بھی پیش آئی تھی جس کا ذکر رجب علی بیگ سرور اور اس کے پہلے اڈیشن (1259ھ) کی نثر خاتمہ میں اس طرح شروع کرتے ہیں:

''برسوں یہ فسانہ کساد بازاریِ زمانہ سے تہہ رہا، مشہور نہ ہوا۔''

رشید حسن خاں کا یہ اڈیشن بھی برسوں تہہ رہا، لیکن اس کی شہرت کا آغاز اس کی ترتیب کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ اُردو تحقیق کی عام روش سے رشید حسن خاں ک سخت شکایتیں ہیں اور انھوں نے بعض محققوں کے مرتب کیے ہوئے کلاسیکی متون کی بے دردی سے چیر پھاڑ کی ہے۔ اس لیے یہ خبر خاصی دل چسپی کے ساتھ سُنی گئی تھی کہ اب رشید حسن خاں خود ایک کلاسیکی متن، اور وہ بھی ''فسانۂ عجائب'' کا سا خطرناک متن، مرتب کر رہے ہیں۔ یہ تجسس پیدا ہونا فطری تھا کہ رشید حسن خاں متن کی تحقیقی تدوین کے جس معیار کا دوسروں سے مطالبہ کرتے ہیں اسے خود کہاں تک قائم رکھ پاتے ہیں۔ اس اڈیشن کی اشاعت کے بعد یہ بات بلا تامل کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی تنقیدی اور احتسابی تحریروں میں تدوینِ متن کے جس مثالی نمونے کا تصور پیش کیا تھا، عملاً اس سے بھی کچھ بہتر نمونہ پیش کر دیا ہے، اور اس بات کا اعتراف کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ابھی تک اُردو نثر کا کوئی متن اس شان کے ساتھ مرتب نہیں ہوا تھا۔

تدوین کا یہ کام رشید حسن خاں نے 1978 کے قریب شروع کیا تھا۔ اس میں سب سے سخت مرحلہ ''فسانۂ عجائب'' کے متن کی صحیح قرأت کا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے لکھا تھا:

''سچی بات تو یہ ہے کہ اس متن نے مجھے تھکا مارا ہے۔ اس قدر صبر آزما کام ہے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ معلوم نہیں یار لوگوں نے کس طرح اب تک اسے نپٹایا ہے اور اساتذہ نے پڑھایا ہے۔''

اور یہ بھی اطلاع دی:

''پرسوں دو گھنٹے ایک جملے کی نذر ہو گئے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو بھی اس مسرت میں شریک کروں جو حل کرنے کے بعد مجھے حاصل ہوئی تھی۔''

اعروب اور رموزِ اوقاف کا التزام جو پڑھنے والے کے لیے سہولت مہیا کرتا ہے، مرتب کے لیے مشکلوں اور ذمہ داریوں کے پہاڑ کھڑے کر دیتا ہے۔ ان ذمہ داریوں سے عہد برآ ہونا، اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مرتب کے ذہن میں متن کے ہر لفظ کا تلفظ معنی اور ہر جملے کی ساخت مع مفہوم آئینہ نہ ہو۔ اس کے لیے اس کو مصنف کے ذاتی اسلوب اور اس کے عہد اور علاقے کی زبان کے عمومی خصوصیات سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ رشید حسن خاں نے اس سلسلے میں جو کوہ کنی کی ہے اس کا اندازہ ان کے تیار کیے ہوئے متن کے کسی صفحے کو توجہ سے پڑھ کر کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ متن اعراب و اوقاف سے مزیّن ہو کر اپنی شرح آپ کرتا ہوا چلتا ہے اور بجائے خود ایک مکمل تحقیقی کام ہے۔ لیکن اسی کے برابر کا، یا شاید اس سے بھی بڑا، کارنامہ وہ ملحقات (مقدمے، ضمیمے، فرہنگ) ہیں جن کا مجموعی حجم ''فسانۂ عجائب'' کے متن سے زیادہ ہے۔ مقدمہ کئی مباحث پر مشتمل ہے اور اس کے احاطے کا اندازہ ان مباحث کے عنوانات سے ہو سکتا ہے جو حسبِ ذیل ہیں:

''[سرور کی] ولادت، وفات، مدفن، تعلیم اور مختلف فنون سے واقفیت [فسانۂ عجائب کی] وجہِ تصنیف اور زمانۂ تصنیف، نوازش اور اصلاح۔ ''بیانِ لکھنؤ'' کے اختلافات۔ آسان کہنے کی فرمائش، میر امن، باغ و بہار، ضمنی داستانیں، بندر کی تقریر، زبان و بیان۔ خطی نسخے، مطبوعہ نسخے، بنیادی متن [مرتب کا] طریقِ کار، علامات، رموزِ اوقاف....''

''فسانۂ عجائب'' کا سببِ تالیف، زمانۂ تالیف، اس کے مختلف اڈیشنوں کی صورتِ حال، یہ سب تحقیق کے بہت الجھے ہوئے مسائل تھے۔ رجب علی بیگ سرورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' کے حصۂ مختلف زمانوں میں لکھے اور کتاب مکمل کرنے کے بعد بھی اس میں رد و بدل اور حذف و اضافہ کرتے رہے۔ اُن کے ایک حریفِ سخن دہلوی نے طنزاً لکھا تھا کہ ''سرورؔ لکھنوی نے اٹھارہ مرتبہ فسانۂ عجائب کو درست کیا'' اور یہ سلسلہ 1240ھ سے 1280ھ تک چلتا رہا۔ اس طرح چالیس سال تک سرورؔ کتاب میں مداخلت کرتے رہے۔ رشید حسن خاں نے ''فسانۂ عجائب'' کے سب اہم اڈیشنوں کو بار بار پڑھ کر اور ان کا باہم لفظ بہ لفظ مقابلہ کر کے ان مداخلتوں کی روداد مرتب کی ہے۔ یہ محال کی حد تک مشکل کام تھا اور رشید حسن خاں کے سوا شاید کوئی اور اس کا بیڑا اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔

مصنف کے حالاتِ زندگی کی تحقیق اور اس کی سوانح نگاری، متنِ کتاب کے مرتب کی ذمہ داری نہیں ہوتی، لیکن مصنف کے جس حالات کا ربط اُس کی تصنیف سے ہوتا ہے ان پر نظر کرنا ضروری ہے۔ رشید حسن خاں نے اس اصول کا لحاظ رکھا ہے۔ انھوں نے سرورؔ کے عام حالات زندگی کا مختصر بیان کیا ہے لیکن ''فسانۂ عجائب'' کے محرک اول کی شخصیت، سرورؔ اور نوازشؔ کی جلا وطنی کی علت اور اس سلسلے میں لکھنؤ کے محلّہ منصور نگر کی اہمیت پر بعض قرائن کی روشنی میں کچھ اہم امکانات کی نشان دہی کی ہے۔ یہ امکانات جن عجیب انکشافات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں ان کا کوئی حتمی ثبوت دست یاب نہ ہونے کی وجہ سے رشید حسن خاں نے اپنے اخذ کیے ہوئے نتائج کو قیاس آرائی کی حد میں رکھا

ہے۔لیکن اگر سرورؔ اور نوازش کے حالات کی مزید تحقیق کی جائے تو عجب نہیں کہ یہ قیاسات حقیقت بن کر سامنے آجائیں۔

متن کتاب کے بعد ضمیمے آتے ہیں۔ پہلے ضمیمے ''نثر ہائے خاتمۂ کتاب'' میں وہ سب عبارتیں درج کر دی گئی ہیں جو سرورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' کے مختلف اڈیشنوں کے آخر میں لکھی ہیں۔ان عبارتوں سے ''فسانۂ عجائب'' کی تصنیف اور اشاعت کی تاریخ مرتب ہوتی ہے۔

دوسرا ضمیمہ ''تشریحات'' کا ہے۔''فسانۂ عجائب'' کے بہت سے لفظوں اور فقروں کو کئی کئی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔رشید حسن خاں نے اُن مختلف قرأتوں کی وضاحت کے ساتھ اپنی ترجیحی قرأت کا جواز پیش کیا ہے۔ بہت سے لفظوں اور فقروں کے مفاہیم تشریح طلب ہیں، اس ضمیمے میں وہ تشریحیں بھی ہیں، بہت سے لفظوں کے تلفظ و املا اور تذکیر و تانیث کے تعین میں بحث طلب امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے ضمیمے ''انتساب اشعار'' میں ان شعروں کی تحقیق ہے جو سرورؔ نے ''فسانۂ عجائب'' میں جا بجا درج کیے ہیں۔ان شعروں میں ضرورتاً ''اور بعض میں سہواً'' کچھ تبدیلی کر دی ہے۔رشید حسن خاں نے ان شعروں کی تصحیح قرأت اور ان کے مصنفوں کا تعین کیا ہے۔ یہ کتنا جان کاہ کام تھا اس کا اندازہ رشید حسن خاں کے سوا شاید کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔

چوتھا ضمیمہ ''اشخاص، مقامات، عمارتیں''۔سرور کے دیباچہ کتاب میں جو اسماے خاص آئے ہیں ان کے متعلق معلومات فراہم کرنا بہت ضروری مگر بہت مشکل کام تھا۔رشید حسن خاں نے حسبِ توقع یہ کام بھی بڑی اسلوبی سے انجام دیا ہے۔

پانچویں ضمیمے ''تلفظ اور املا'' اور چھٹے ضمیمے '''' الفاظ اور طریق استعمال'' کا تعلق رشید حسن خاں کے خاص پسندیدہ میدان سے ہے۔ان ضمیموں کے تحت انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے متعلق وہ بجا طور پر ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کہہ سکتے ہیں، اور اگر چہ ان ضمیموں کا تعلق اصلاً ''فسانۂ عجائب'' کے متن سے ہے لیکن ان کا فائدہ کلاسیکی اُردو نثر کے بہت سے دوسرے متون کو بھی پہنچے گا۔

ساتواں ضمیمہ اختلافِ نسخ کا ہے۔ یہ پچاسی (85) صفحوں پر مشتمل مکمل کام تھا مگر کتاب کی بڑھتی ہوئی ضخامت کے پیش نظر اس میں سے صرف وہ چودہ صفحے شامل ہیں جن میں دیباچۂ کتاب کے اختلافاتِ نسخ دیے گئے ہیں۔اور متنِ کتاب کے اختلافات روک لیے گئے ہیں۔تدوینِ متن کے ایک بہت ضروری عنصر سے کتاب کا عاری رہ جانا افسوس ناک ہے اس سے زیادہ افسوس ناک یہ بات ہے کہ اس نقصان کو محض کتاب کی ضخامت ذرا کم رکھنے کے لیے گوارا کرنا پڑا ہے۔اُمید ہے کتاب کے دوسرے اڈیشن میں، جن کی نوبت خدا کرے جلد آئے، یہ کمی پوری کر دی جائے گی۔

فرہنگ کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عام الفاظ ہیں، دوسرے میں عربی عبارتوں اور تیسرے میں فارسی شعروں اور فقروں کے معنی دیے گئے ہیں۔

کتاب کے مشتملات کا یہ تعارف اس لیے پیش کیا گیا کہ پڑھنے والوں کو رشید حسن خاں کے طریق کار اور تدوینِ متن کے اصول و آداب کا علم ہو جائے۔اس علم کی علمی تربیت کے لیے ''فسانۂ عجائب'' مرتبہ رشید حسن خاں کا مطالعہ ضروری ہے۔اس اڈیشن کا مقصد پڑھنے والوں، خصوصاً طالب علموں کے لیے ''فسانۂ عجائب'' کے مطالعے کو خوش گوار اور آسان بنانا ہے لیکن یہ طالب علموں سے بھی زیادہ اُردو کے محققوں، اُستادوں اور نقادوں کے لیے مفید ہے۔ محققوں کو اُسے تحقیق کی درسی کتاب کی طرح پڑھنا چاہیے۔اساتذہ کو یہ اڈیشن ذہین اور متجسس طالب علموں کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا سکتا ہے اور نقاد اس اڈیشن کو پیشِ نظر رکھ کر صحیح معنوں میں ''فسانۂ عجائب'' کا تنقیدی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

اس اڈیشن کے انتساب کا بھی ذکر ضروری ہے۔رشید حسن خاں سے اس کی اُمید تو خیر کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی کسی کتاب کو کسی صاحب اقتدار شخصیت کے نام معنون کریں گے، البتہ اس مہتم بالشان تحقیقی کارنامے کا انتساب کسی بڑے محقق کے نام ضرور متوقع تھا، لیکن اس کے انتساب کی عبارت یہ ہے:

''لکھنؤ کے ایک فدائی جناب صباح الدین عمر کی نذر''

صباح الدین عمر صاحب ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنؤ کے سابق مدیر، اتر پردیش اُردو اکادمی کے بنیاد گزار اور سابق سکریٹری، اور لکھنؤ کی معروف شخصیت ہیں، لیکن تحقیق کی دنیا سے الگ ہیں۔رشید حسن خاں کی کتاب موصول ہونے کے بعد انھوں نے خاصی پریشانی کے عالم میں مجھ کو فون کیا کہ ''خاں صاحب نے یہ کیا کیا، اب لوگ پوچھتے پھریں گے کہ یہ صباح الدین عمر صاحب کون صاحب ہیں جن کو ایسی زبردست تحقیقی کتاب پیش کی گئی ہے۔'' لیکن صباح الدین صاحب واقعی لکھنؤ کے فدائی اور خاموش خدمت گار ہیں۔''فسانۂ عجائب'' کا یہ انتساب ان کی شخصیت کے اعتارف کی بہت عمدہ صورت ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ خود رشید حسن خاں کی اس ادبی خدمت کا اعتراف کس صورت میں کیا جاتا ہے۔

(کتاب نما، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، گوشۂ رشید حسن خاں، جلد 30، شمارہ 8، اگست 1990، صفحہ 104-101)

(منتخب مضامین، نیر مسعود، زیرِ اہتمام، آج کی کتابیں، سٹی پریس بُک شاپ، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400، پہلی اشاعت 2009، صفحہ 214 تا 218)

نیّر مسعود

بہ نام رشید حسن خاں

(بہ حوالہ مضمون ''مثنویاتِ شوق،لکھنوی معاشرت کے آئینے)

برادرم خاں صاحب آداب!

خدا کرے آپ کی صحت بہ حال ہو۔ یہ خط کچھ با دلِ نا خواستہ لکھ رہا ہوں ۔قصّہ یہ ہے کہ اِدھر آپ کے مضمون ''مثنویاتِ شوق ،لکھنوی معاشرت کے آئینے'' (ایوانِ اُردو،اپریل 1998) کے حوالے سے مجھ پر طعنے پڑرہے ہیں کہ ''آپ کے دوست'' اور ''آپ کے محقق اعظم'' نے یہ مضمون جولکھاہےاس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں ۔اتفاق سے ایوانِ اُردو کا یہ شمارہ میرے پاس نہیں آیا،لیکن ایک صاحب نے مجھے اس کی نقل بھجوادی۔ بھائی، ''آپ نے تو حد کردی۔میں آپ کو اب بھی اپنے عہد کا سب سے بڑے محققوں میں شمار کرتا ہوں ،لیکن یہ مضمون ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تحقیقی اصولوں کی جملہ خلاف ورزیوں ،غیر محققوں کی تحقیقی خرمستیوں اور ''ناتحقیقی'' ستم ظریفیوں کی مثال میں نمونے کے طور پر لکھا ہے۔اب میں طعنوں کا جواب تو کیا دے پاتا،مناسب یہی معلوم ہوا کہ اس مضمون کی سب نہیں کچھ قباحتوں کو آپ کے گوش گزار کرکے دریافت کروں کہ یہ معاملہ کیا ہےاور آپ کے سے محقق کو بیٹھے بٹھائے یہ کیا ہو گیا۔

یہ مضمون اگر اپنے عنوان کی حدوں کے اندر ہی رہتا تو میں اس کے دفاع میں یہ کہہ سکتا تھا کہ خاں صاحب نے صرف یہ دکھایا ہے کہ شوق کی مثنویاں لکھنوی معاشرے کے کن پہلوؤں کا آئینہ نظر آتی ہیں اور مضمون کی بنیادی خامی یہ ہے کہ مضمون نگار نے ان مثنویوں کو سوچ سمجھ کر پڑھا اور اس ناقص مطالعہ کی وجہ سے ان آئینوں کی بعض تمثالیں انھوں نے نہیں دیکھیں (مثلاً زہرِ عشق کا دوتہائی حصہ جو ہیروئن کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے،اور جو اس مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب رہا ہے،مضمون نگار نے اس کو نظر انداز کردیا اس بحث سے سروکار نہیں رکھا کہ وہ کون سے معاشرتی دباؤ تھے جن کی وجہ سے ایک لڑکی کو محض اپنی محبت کا راز کھل جانے پر اس شہر لکھنؤ میں خودکشی کرنا پڑ گئی جہاں مضمون نگار کی رائے میں عورتوں مردوں کے ناجائز جنسی تعلقات عام تھے) مگر آپ نے غضب یہ کیا کہ لکھنوی معاشرت کے موضوع ہر اپنے برائے نام اور یک رُخے مطالعے کو کافی جان کر خود طبع آزمائی شروع کردی۔ بھائی، کسی تہذیب اور معاشرے کے تجزیاتی اور تحقیقی مطالعے کے کیا آداب اور طریق کار ہوتے ہیں اس کی ابجد سے ناواقفیت کے باوجود اگر آپ کو قلم اُٹھانا ضرور تھا تو کم از کم اس موضوع پر غیر مربوط سا مطالعہ ہی کر لیتے۔آپ کا عالم یہ ہے کہ ''گذشتہ لکھنؤ'' بھی آپ نے پوری طرح نہیں پڑھی،کمال الدین حیدر کی تاریخ تک (باوجود یہ کہ وہ انگریزوں کے لیے ان کے ایک وفادار نے لکھی تھی) آپ کی رسائی نہیں،نول کشور کی تواریخ نادرالعصر، جو ایک انگریز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے تحریر ہوئی تھی۔(اس کا نام ہی ''تحفۂ کرنل ایبٹ'' ہے) وہ بھی آپ کے لیے مجہول رہی ۔لکھنؤ کی گھریلو معاشرت کا آپ کو پتا ہی نہیں اس لیے عباس حسین ہوش کی مثنوی ''تفسیرِ عفت''، ''فسانۂ نادر جہاں''، لکھنؤ کی عورتوں کے بارے میں خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مجموعے (ہم جولی،قصہ اوّل و دوم) قسم کے ضروری ماخذوں سے آپ کی شناسائی نہیں ۔لکھنؤ میں طوائفوں کی حیثیت پر آپ فیصلہ کُن گفتگو کرتے ہیں اور ''امراؤ جان ادا'' تک کو اُٹھا کر نہیں دیکھتے کہ وہ آپ کی تائید کررہی ہے یا نہیں۔''قدیم ہُنر و ہُنر مندانِ اودھ''، ''وضع دارانِ لکھنؤ'' حتیٰ کہ ماہ نامہ ''نیا دور'' کے دونوں حالیہ اودھ نمبر بھی آپ کو دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔پیشگی فیصلہ کرلینے کے بعد جذبات اور تاثرات کی تابع تحقیق کو غیر جانب داری کے انداز میں پیش کرنا اور اپنے پیشگی جذباتی فیصلے اور قلبی خواہش کے برخلاف شواہد کو دیکھنے سے کنھیا لال کپور کے ''مسٹر ڈالر'' کی طرح بالارادہ معذور ہو جانا آپ کی تحقیق کی کمزوری رہی ہے۔لیکن اس مضمون میں یہ کمزوری، ناقابلِ یقین حد تک بڑھ کر ''خواہش زدہ'' تحقیق کی مکمل مثال بن جاتی ہے۔

لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے پر کچھ لکھنے کے لیے کسی قسم کے اور کتنے ماخذوں سے استفادے کی ضرورت ہے اس کا اندازہ آپ کو نہ سہی، پھر بھی ذرا اپنے مضمون کے ماخذوں کی فہرست پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

1۔نجم الغنی،تاریخ اودھ (صرف منفی شواہد)

2۔شرر،گذشتہ لکھنؤ (صرف منفی شواہد)

3۔شوق،مثنویاں (صرف منفی شواہد)

4۔پروفیسر آل احمد سرور (لکھنوی طوائفیں)

5۔پروفیسر خورشید الاسلام (لکھنوی طوائفوں کی سوز خوانی)

یہ لکھنؤ کی پیچیدہ اور کثیر الابعاد تہذیب و معاشرت پر آپ کے ماخذوں کی کُل بساط ہے۔اس کا دوسروں کو تو کیا،خود آپ کو بھی یقین نہ آنا چاہیے اور اس بساط پر جس تیقّن اور خود اعتمادی کے ساتھ قولِ فیصل کے انداز میں آپ نے گفتگو کی ہے اور تحقیق کے معروضی، منطقی اور غیر جذباتی انداز کو جس طرح نظر انداز کیا ہے اس کو بے علمی کی جسارت کے سوا اور کیا کہا جائے۔

آپ کا یہ قول پسند ہے کہ تحقیق کی بنیاد شک پر ہوتی ہے، لیکن آپ کے اس مضمون میں تحقیق کی بنیاد شک پر نہیں، ایمان، بل کہ ایمان بالغیب پر، اور شواہد پر نہیں ،مفروضوں بل کہ افواہوں پر ہے۔ ایمان کا ایسا مظاہرہ بھی کم دیکھنے میں آتا ہے کہ لکھنوی معاشرے کا محقق پروفیسر خورشید الاسلام اور میرے شفیق محترم سرور صاحب سے استناد کرے، اور وہ محقق رشید حسن خاں کے پائے کا ہو۔ خورشید صاحب اور سرور صاحب بہر حال دیانت دار نقاد ہیں۔ وہ خود اس پر راضی نہ ہوں گے کہ انھیں اس موضوع پر سند بنا دیا جائے۔

مذکورۂ بالا پانچ اور سچ پوچھیے تو صرف تین، وہ بھی نامکمل ماخذوں کے بل بوطے پر آپ نے جو کچھ لکھا ہے اور اس لکھے ہوئے سے جو منطقی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اس کے تھوڑے سے نمونے دیکھ لیجیے:

1۔ لکھنؤ کے علمائے فرنگی محل ہوں یا خان دانِ اجتہاد مراجع دین، یا صوفیائے کرام کے حلقے، یا انیس یا بیر اور محسن کاکوروی اور امیر مینائی قسم کے شاعر، یا پابندیِ سرع میں حد سے بڑھ کر لطیفوں کا موضوع بن جانے والے نقات اور دوسرے اشرافیہ طبقات، عیش طلبی نے ان میں سے ''کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا۔ عیش، تفریح اور لذت اندوزی کو زندگی کا واحد مقصد بنا دیا تھا۔ 6

(کسی کو کسی اور کام کا رکھا ہی نہیں تھا، کا مطلب یہ ہوا کہ لکھنؤ میں بلا استثنا ہر طبقے کا ہر فرد صرف، عیش تفریح اور لذت اندوزی میں منہمک تھا اس لیے کہ یہی اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا)

2۔ لکھنؤ کے مختلف افراد کی جو تصویریں کثیر تعداد میں موجود ہیں اور یہاں کے لوگوں کی وضع قطع اور لباس وغیرہ کے بارے میں جو چشم دید بیانات فراوانی کے ساتھ دستیاب ہیں وہ آپ کی نظر میں معتبر نہیں ہیں اس لیے کہ:

''لکھنؤ میں یہ عام وضع ہوگئی (تھی) کہ سر پر مانگ، اس پر مسالے کی کام دار ٹوپی.....ماتھے پر دونوں طرف پٹیاں۔ وغیرہ وغیرہ (آپ کا ماخذ: شرر) 7

مگر ان تصویروں میں عام طور پر یہ ''عام وضع'' نظر نہیں آتی۔ مثلاً میر انیس کے سر پر سفید سوتی پیچ گوشہ ٹوپی، نواب والا جاہ کے سر پر عمامہ نظر آتا ہے اور چکن کی دوپلی ٹوپی تو لکھنؤ میں رواجِ عام رکھتی تھی، لیکن آپ کا تائید یافتہ بیان ان شواہد کو جھٹلا رہا ہے۔ البتہ یہاں صرف ایک سوال کرنا ہے کہ صرف آپ کی نظر سے لکھنؤ والوں کی قلمی، عکسی تحریری تصویریں نہیں گزریں؟ یا شرر کی زبان پر آپ اپنی آنکھوں سے زیادہ ایمان رکھتے ہیں؟

3۔ لکھنؤ کی تہذیب کا بارے میں وہ سارے معاشرہ چشم دید بیان اور وہ تمام راست ماخذ جو طوائفوں کے ذکر سے خالی ہیں۔ جھوٹے اور گم راہ کُن ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کا اصل مظہر طوائفیں تھیں۔ اس لیے کہ آپ کے بقول ''طوائف کو معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف مل گیا تھا۔''

یعنی جو لوگ لکھنؤ میں کسی نہ کسی طوائف سے شرفِ ملاقات حاصل نہ کر سکے انھوں نے لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے کو دیکھا ہی نہیں۔

4۔ آپ لکھتے ہیں:

''اس معاشرے میں طوائف کی اہمیت اور حیثیت کا اس سے بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عزاداری جیسی مذہبی چیز بھی ان کی دسترس سے باہر نہیں رہی تھی۔ 8

لکھنؤ کے شہدوں اور فقیروں کی عزاداری بھی مشہور تھی، بل کہ عزاداری کسی کی بھی ''دسترس سے باہر نہیں رہی تھی''۔ کیا آپ ''اس معاشرے میں شہدوں، فقیروں بل کہ عزاداری کی دست گاہ رکھنے والی ہر کس و ناکس کی اہمیت کا اور حیثیت کا اس سے بہ خوبی اندازہ'' کر سکتے ہیں؟

5۔ فرنگی محل، خان دانِ اجتہاد اور دوسرے دینی مراکز کا پھر ذکر کرنا پڑ رہا ہے، حالاں کہ آپ کا مضمون اس ذکر سے خالی رکھا گیا ہے، کیا اس لیے کہ آپ حسبِ تحقیق لکھنؤ کے ''معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف'' ان مرکزوں کو نہیں طوائفوں کو حاصل تھا۔ تہذیب کے میدان میں یہ مراکز کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن مذہب بھی تہذیب اور معاشرے کا اہم جز ہوا کرتا ہے۔ آپ نے لکھنؤ میں ''مذہبیت کی طاقت و روایت'' اور تہذیب پر اس کے ''دیرپا اثرات'' کو تسلیم بھی کیا ہے (6) سوال یہ ہے کہ کیا مذہب کے میدان میں بھی یہ دینی مراکز ہیچ اور بے حیثیت تھے؟ آپ کا مضمون اس سوال کا جواب اثبات میں دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ عزاداری میں بھی:

''طوائفوں نے سوزخوانی کے کمال سے فائدہ اُٹھا کر دخل حاصل کر لیا تھا اور اس طرح دُنیا ہی نہیں، آخرت بھی ان کے ہاتھ میں چلی گئی تھی 8 (آپ کا ماخذ: خورشید الاسلام)

اس بیان کی تائید میں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ علمائے فرنگی محل میں کسی ایسے بزرگ کا سراغ مجھے نہیں ملا جنھوں نے سوزخوانی کے فن میں طوائفوں کے برابر کمال حاصل کیا ہو، اور خان دانِ اجتہاد کے علما تو سوزخوانی کے وقت (آخرت کو طوائفوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر؟) مجلس سے اُٹھ جاتے تھے۔ بھائی، یہ سب کیا ہے؟ ذہن کو زحمت دیے بغیر لکھنا اور لکھنے کے بعد ذہن کو زحمت نہ دینا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ لکھنؤ میں باکمال سوزخوانوں کو آخرت پر قبضہ دے دیا جاتا تھا۔ مندرجۂ بالا انشا پردازنہ فقرے کا اگر اس کے سوا کچھ اور مطلب نکلتا ہو تو براہِ کرم مجھ کو (خود اپنے ماخذ سے پوچھ کر) بتائیں

6۔آپ کا تائید یافتہ ایک اور انکشاف :لکھنؤ کی بیگموں میں کوئی ایسی نہیں تھی جو''چھنال'' نہ ہو۔9 (آپ کا ماخذ:شوق کی ایک خیالی داستان کا ایک خیالی نسوانی کردار)۔آپ سے یہ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے کہ خود آپ کا کیا خیال ہے۔

7۔ہمارے آپ کے محترم بزرگ سرور صاحب طوائف شناسی میں وہ مرتبہ رکھتے ہیں کہ آپ کا سا باعمل محقق طوائفوں کی اداؤں کی پہچان کے لیے ان کی سند پیش کرتا ہے اور شوق کی ہیروئنوں کے بارے میں سرور صاحب کے اس جملے کو''نہایت بلیغ بات'' کہہ کر نقل کرتا ہے:

''مہہ جبیں میں کم اور مہہ لقا میں زیادہ ہمیں طوائف کی جھلک نظر آتی ہے۔''(ص،8)

یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف آپ لکھنؤ میں ہر طرف طوائفوں کی تصویریں دکھا کر اپنی تحقیقی کمائی بڑھانے میں سرگرم ہیں دوسری طرف طوائفوں کی گویا اتنی بھی پہچان نہیں رکھتے جتنی سرور صاحب کے سے نستعلیق بزرگ رکھتے ہیں۔کیا آپ شریف عورتوں اور طوائفوں میں تمیز نہیں کر سکتے؟

عجیب تر بات یہ کہ ایک طرف تو آپ معلومات کی فراہمی اور''تمتع زہر گوشہ اے'' کی سعی میں یہاں تک سرگرداں ہیں کہ طوائفوں کے معاملے میں بھی سرور صاحب کے سے غیر متوقع ماخذ تک پہنچ جاتے ہیں،دوسری طرف آپ کے ماخذوں کی تعداد پانچ سے زیادہ نہیں بڑھ پاتی اور ابتدا میں جن چند اہم اور آسانی کے ساتھ دکھائی دے جانے والے ماخذوں کا میں نے ذکر کیا ہے،وہ بھی آپ کو نظر نہیں آتے (وہی'مسٹر ڈالر'والا کمال)

8۔ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں۔آپ کے اس مضمون کا موضوع دہلی معاشرہ نہیں تھا لیکن آپ نے اسے بھی لپیٹے میں لے کر لکھنوی معاشرے سے بھی گیا گزرا دکھایا۔لکھنؤ میں جو''لذت اندوزی اور عیش کوشی'' معاشرے کے نمائندہ طبقے پر چھائی ہوئی تھی (ص۔6)اس کا تذکرہ کرتے کرتے آپ بیان کی ابتذال پر آتے ہیں اور شوق کی'بہارِ عشق' کے کچھ شعروں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''ان میں ابتذال ہے،کھلا ہوا ابتذال۔لیکن ایسے شعروں کی تعداد بہت سے بہت 24 یا 25 ہو گی،اس سے زیادہ نہیں ایسی دوسری مثنویوں کے ایسے ہی اشعار کو اگر یکجا کیا جائے،مثلاً اُردو ہی میں میر اثر اور مومن کی مثنویوں کے ایسے اشعار کو،تو پھر شوق کا نام اس سلسلے میں سرفہرست نہیں لکھا جا سکے گا۔کئی سطر نیچے لکھا جائے گا۔'' 10

اور اس کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں۔

''اسی طرح (یعنی اثر اور مومن کی طرح) شوق کی مثنویوں کو بھی ادب کا حصہ اور شوق کو (اثر اور مومن کی طرح) اپنے معاشرے کا ترجمان مانا جائے گا۔معاشرہ جیسا تھا ترجمانی بھی ویسی ہی ہو گی اور تصویر بھی ویسی ہی بنے گی۔'' 10

اور یہ معاشرتی تصویر ان مبتذل شعروں کے آئینے میں بنے گی جن کے مصنف شوق لکھنوی کا نام ابتذال یعنی اپنے معاشرے کی سچی تصویر کشی کرنے کے لحاظ سے اثر دہلوی اور مومن دہلوی کے ناموں سے''کئی سطر نیچے لکھا جائے گا''۔اور اپنے مبتذل کلام کے ذریعے ایسے دہلوی معاشرے کی تصویر دکھانے والوں میں اثر اور مومن کے نام شوق سے''کئی سطر اوپر'' لکھے جائیں گے۔میری سمجھ میں نہیں آیا کہ لکھنؤ کے معاشرے کو پست اور مبتذل ٹھہرانے کے بعد آپ نے دہلی کے معاشرے کو اس سے بھی بدتر ظاہر کرنا کیوں ضروری سمجھا اور اپنی تہذیبی روایت کی ان دو بڑی (اور دونوں مرحوم) علامتوں کے خلاف کون سی در پردہ نفسیاتی گتھی آپ کو ان کا دشمن بنائے ہوئے ہے۔کیا ذاتی طور پر آپ کو دہلی اور لکھنؤ میں کچھ تلخ تجربے ہوتے ہیں؟ دہلی اور لکھنؤ کی پُرانی آویزش میں ملوث لکھنوی جماعت آپ کے اس فیصلے سے خوش ہو کر آپ کو دہلوی معاشرے کا نبّاض مان سکتی تھی۔لیکن میں لکھنؤ کو دہلی کی ضمنی پیداوار مانتا ہوں (یہ تو آپ کے بھی علم میں ہونا چاہیے کہ لکھنؤ کے بیش تر ممتاز گھرانے اصلاً دہلی کے تھے)اور دہلی کا زوال مجھ کو لکھنؤ کی تباہی سے بڑا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ممکن ہے اس احساس میں اپنی تہذیبی روایت سے میرے تعلقِ خاطر (آپ کی رائے میں قدامت پسندی) کو دخل ہو۔بہر حال میں آپ کی اس نتیجہ گیری سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ اثر،مومن اور شوق کی مثنویوں پر''معاشرہ جیسا،ترجمانی بھی ویسی ہی،اور تصویر بھی ویسی ہی'' کا اطلاق ہوتا ہے۔اور''ابتذال کھلا ہوا ابتذال''،لکھنؤ سے زیادہ دہلی کے معاشرے کی ترجمانی کرتا ہے۔دہلی اور لکھنؤ کی بہت سی ادبی بضاعت میں سنجیدہ اخلاقی معاشرہ قدروں کی عکاسی ہوئی ہے۔لیکن وہ تصویریں آپ کو نظر نہیں آتیں،انہیں''مسٹر ڈالر'' کی طرح۔

9۔تضاد تحقیق کے لیے زہر قاتل ہے۔جو محقق کے حافظے اور قوتِ تمیز سے لے کر اس کی نیت اور دیانت تک کو مشکوک کر سکتا ہے۔آپ کی تحقیقی تحریروں میں یہ تضاد گاہ گاہ نظر آتا ہے۔لیکن اس مضمون میں آپ نے تضاد کی صنعت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔کچھ نمونے دیکھیے۔

(الف)لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں آپ لکھتے ہیں''کم سے کم مدت میں اس کو فروغ حاصل ہو گیا''۔کم سے کم مدت کا مطلب ہوا تقریباً اچانک (میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں اور سرور پر اپنی کتاب میں لکھنوی تہذیب کے یک لخت عروج'' کا ذکر کر چکا ہوں 44)لیکن آپ اسی تقریباً اچانک فروغ پا جانے والی تہذیب کے تشکیلی عناصر کی بحث میں یہ بھی لکھ دیتے ہیں:

''ایسی بات نہیں تھی جو اچانک واقع ہوئی ہو۔'' 9

(ب) آپ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرے میں ''ظاہر سب کچھ تھا باطن خالی تھا۔''

اپنے مادہ پرستانہ عقائد کے ساتھ آپ کو ظاہر اور باطن کی بحث سے دور رہنا چاہیے تھا۔ اس درخواست پر آپ کان نہیں دھریں گے کہ باطن کے خالی ہونے اور خالی نہ ہونے کی دو ایک مثالیں عنایت کیجیے۔ اس حقیقت پر بھی غور کرنے میں آپ کی طبیعت گھبرائے گی کہ باطن کا خالی ہونا انسان کی حد تک محالات سے ہے۔ اس لیے اس کی فکر چھوڑیے اور اپنے بیان کا تضاد دیکھیے کہ لکھنوی تہذیب میں باطن کو خالی کر دینے کے ڈیڑھ سطر بعد آپ لکھتے ہیں۔

> ''ہاں ایک چیز ضرور ایسی ہے جس نے دیرپا اثرات پیدا کیے اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت و روایت، جس کا تعلق حقیقی طور پر باطن سے ہوتا ہے۔ مذہب کے اثرات افراد کے احساس کا جز ہوتے ہیں اور پورے گروہ کی زندگی پر حاوی رہتے ہیں۔ عمل کتنا ہی کم ہو، عقیدہ ذہن کی تہہ میں پیوست رہا کرتا ہے۔''
>
> 6

''دیرپا اثرات''۔ ''مذہبیت کی طاقت و روایت''، ''حقیقی طور پر باطن'' سے تعلق ''احساس کا جز''، ''عقیدہ'' جو ذہن کی تہہ میں پیوست رہا کرتا ہے'' وغیرہ کے معنی تو میری سمجھ میں آتے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سب کے ہوتے ہوئے ''ظاہر سب کچھ تھا، باطن خالی تھا'' کا کیا مطلب ہوا:

> ''یہ عجیب بات تھی کہ (لکھنؤ میں) ایک طرف تو عیش طلبی اور لذت کوشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا، اور اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس معاشرے کا حسن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ ان عناصر نے بھی تضاد اور ثنویت، یعنی دہرے پن کو معاشرت کا نہایت حسین چیز بنا دینے میں بہت کامیابی حاصل کی۔'' 7

آپ کے مضمون کے سیاق و سباق میں جتنا جتنا غور کرتا ہوں اتنی اتنی ان جملوں اور مضمون کی معمائیت باری باری بڑھتی جاتی ہے۔ آپ بھی غور کر کے دیکھیے۔ لیکن اس سے قطع نظر، یہاں گفتگو تضاد کی ہے۔ پڑھنے والوں کی سہولت کی خاطر آپ نے ''ثنویت'' کا ترجمہ بھی کر دیا ہے (یعنی دہرے پن کو) لیکن اگلے صفحے پر یہ فیصلہ بھی سنایا ہے:

> ''معاشرے میں نفاست اور صلابت کے عدم توازن نے یک رُخا پن پیدا کر دیا تھا۔'' 8

کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ منشائے مصنف کیا ہے۔ آپ نے دہرے پن اور یک رخے پن سے ایک ہی معنی مراد لیے ہیں؟

(د) تضاد کو صنعت بنا دینے کی بات میں نے یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

> ''غیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا (کہ کچھ دوسری عورتوں کے بھی مردوں سے ناجائز تعلقات ہیں) تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اسی طرح جب نواب مرزا شوق اپنی مثنوی ''فریبِ عشق'' میں یہ کہتے ہیں (کہ بیگموں میں کون ہے جو چھنال نہیں) تو (انھوں نے) معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے۔ لیکن اس کو بیان کرنے کی یا تو جرأت باقی نہیں رہی تھی یا پھر وہ معاشرے کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجائش گویا ختم ہو چکی تھی۔''

آپ کو بیان کا تضاد نظر آیا؟ آپ کا کہنا ہے کہ اس معاشرے میں عورتوں کا غیر مردوں سے تعلقات رکھنا۔

(1) اتنا بڑا عیب سمجھا جاتا تھا کہ لوگ اس کو زبان پر لانے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ یا

(2) کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کا ذکر یا اس پر اعتراض کیا جائے۔

عام تضاد کے لیے ''یک بام و دو ہوا'' کی ضرب المثل استعمال ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا یہ بیان ''دو بام دیک ہوا'' کی عمدہ مثال ہے اور یہ تضاد کو صنعت بنا دینے کی بھی عمدہ مثال ہے۔

(10) مذہب کی گفتگو میں آپ نے کئی جگہ علم و فکر کے دائرے سے باہر قدم رکھا ہے۔ مثلاً آپ لکھنؤ میں ''بہت سی ایسی رسمیں پیدا'' ہو جانے کا ذکر چھیڑتے ہیں جن کا حقیقتاً مذہب سے لازمی تعلق نہیں تھا 7 اور اس کو صرف لکھنؤ سے مخصوص قرار دیتے ہیں۔ مذہب کے حوالے سے ایسی رسموں کا رواج پایا جانا جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہ ہو مذہبیاتِ عمرانیات (اور شاید کچھ اور علوم کا بھی) ایسا موضوع ہے جس پر آپ کو اظہارِ خیال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس عالم گیر مظہر کو لکھنؤ سے مخصوص کر دینا تو ایسی بات ہے کہ معاملے میں آپ اپنی بے علمی کا حلفیہ اعتراف کریں تو بھی اسے آپ کی کسرِ نفسی پر محمول کیا جائے گا۔ کیا آپ کو واقعی زیدہ نہ سہی، صرف ہندوستان کے مختلف خطوں ''فرقوں'' اور مسلکوں کی ان رسموں کا بتنا نہیں جن کا ''حقیقتاً'' مذہب سے ''لازمی'' تعلق نہیں ہے یا یہ بھی وہی ''مسٹر ڈالر'' کی معجز نمائی ہے۔

(11) آپ لکھنؤ کی مذہبیت کے تمام مظاہر کو بلا استثنا ''خارجی زندگی سے قریب تر 7'' بتاتے ہیں۔ اس کیا مراد ہے؟ اور ان مظاہر کے مقابل ''دور تر'' مظاہر کون سے ہوں گے اور ان کی اچھائی بُرائی کی پہچان اور معیار کیا ہو گے؟ اس کی وضاحت کی درخواست پر بھی آپ ''باطن خالی'' کی وضاحت کی درخواست کی طرح کان نہیں دھریں گے، لیکن اس پر غور کیجیے کہ لکھنؤ میں مختلف مذہبی مما لک کی دینی تصنیفوں، مذہبی سرگرمیوں، صوفیائے کرام کے افادوں کا صحیح شمار تک ممکن نہیں صوفیوں کو تو خصوصیت کے ساتھ ''اہلِ باطن'' اور ''اہلِ عرفان'' کہا جاتا ہے۔

خرچ ٹھہرا دیا۔

(12) مخاصمانہ جذبات اور پیش حکمی کے تحت کی جانے والی خواہش زدہ تحقیق کیا کیا کرشمے دکھا سکتی ہے اس کے کچھ نمونے آپ کے سامنے پیش ہوئے۔ لیکن ایک کرشمہ آپ کے مضمون میں ایسا ہے جو بہتوں کی، اور اگر غور کیجیے تو خود آپ کی بھی سخت دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے۔ پُرانے زمانے کے ایک شہر کی عورتوں کو بدکار ثابت کرنے کی خواہش سے مغلوب ہو کر آپ نے اس زمان و مکان تک چلے آئے اور شرر کا یہ قولِ فیصل کسی اختلافی نوٹ یا مستثنیات کے امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے نقل کر گزرے:

''رہے عورتوں کے اخلاق و عادات، اس بارے میں ہمارا عام دعوا ہے کہ جن لوگوں کو زنا کاری کا شوق ہو، ان کی عورتیں پارسا نہیں ہو سکتیں۔''

اور یہ دعوا کسی مخصوص جگہ اور زمانے کے لیے نہیں بل کہ ''عام'' ہے۔ آپ نے کمال کیا ہے قیدی کے ساتھ اس کو بھی اپنے مضمون کے استناد اور استشہاد میں استعمال کر لیا اور شرر کے ساتھ۔ **''اقدتُ بھٰذالامام''** والا رویہ یہاں بھی ترک نہیں کیا۔ کاش اس اقتباس کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے سے پہلے اس کے غوامض پر غور کر لیتے۔

آپ نے گذشتہ زمانے کے، ایک شہر میں محدود معاشرے سے تجاوز کر کے اور جغرافیائی حدوں کو توڑ کر خود اپنے عہد کے معاشرے تک کو لے ڈالا۔ بھائی، خدا کے لیے مردوں کی مکاریوں کی سزا (یا دفاع؟) میں خانہ دار عورتوں کے دامن کو اس طرح آلودہ نہ کیجیے۔

اب اس کے آگے آپ کے مضمون کی کرشمہ کاریوں کی نشان دہی کیا کروں از راہِ کرم میرے معروضات کا جلد از جلد جواب دے کر میری تشفی کیجیے اور یہ بھی بتائیے کیا یہ مضمون آپ کی مرتبہ مثنویات شوق میں شامل ہوگا؟ اور اسی صورت میں؟

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ آج کل امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں اودھ اور لکھنؤ پر تحقیق کا بازار گرم ہے اور لکھنوی معاشرے کے الگ الگ مظاہر (طوائفوں سے لے کر علمائے مذہب تک) پر انگریزی میں کتابوں کی خاصی تعداد چھپ چکی ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے اہلِ تحقیق لکھنؤ بھی آتے رہتے ہیں اور ان میں بعض سے میری بھی ملاقات ہو جاتی ہے اور میں ان سے یہ ضرور پوچھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو لکھنؤ کی تہذیب و ثقافت اور معاشرے سے اتنی دل چسپی کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ قریب قریب سب کا جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کی آخری 'COMPACT' تہذیب تھی اور قریب العہد ہونے کی وجہ سے اس کے آثار اور عناصر (جن کو آپ ریت پر بننے والے نقش بتاتے ہیں 6) اب بھی کسی حد تک موجود ہیں اور یہ بھی کہ انگریزوں کے ہندوستانی وفاداروں نے اپنے سفید آقاؤں کو خوش کرنے کی کوشش سے مغلوب ہو کر اپنی ہی تہذیبی، معاشرتی اور تاریخی تصویروں کو جی بھر کر مسخ کیا ہے، درحالے کہ خود انگریزوں نے ان موضوعات پر اپنی تصنیفوں میں قدرے محتاط اور بعض نے تو منصفانہ رویہ رکھا ہے۔ پھر معافی مانگ کر کبھی کبھی یہ بھی کہہ گزرتے ہیں کہ ایسے 'WRETCH'' (اس لفظ کے معنی نہ پوچھیے) آپ ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں جو انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد بھی اپنی تہذیبی روایت کو مفروضہ گھناؤنی تصویریں پیش کرتے ہیں، اس لیے ہم مجبور ہوئے کہ اپنے طور پر لکھنؤ کی تہذیبی روایات کا مطالعہ کریں۔

اپنے موضوع سے متعلق مواد تک ان مغربیوں کی حیرت خیز رسائی کا آپ کو علم نہیں، مجھے کچھ اندازہ ہے، اس لیے کہ میری نظر سے کبھی کبھار ان کی انگریزی کتابیں گزر جاتی ہیں۔ لکھنوی معاشرے پر آپ کے نام ور محقق کا یہ مضمون وہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ پڑھیں گے۔ آپ نے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر یہ سب کیا اور کیوں لکھ دیا، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سفید آقا رہے نہیں جس کی خوش نودی آپ کو مطلوب ہو۔ کچھ کالے آقا ضرور خوش ہوں گے۔ لیکن میں آپ کے مزاج سے واقف ہوں اور آپ کی طرف سے دعوا کر سکتا ہوں کہ ان کی خوش نودی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس جواب نہیں ہے کہ اپنی تحقیق کے دامن کو اپنی غیر تحقیقی جذباتیت اور خواہش زدگی کی سزا (یا دفاع؟) میں اس طرح آلودہ کرنے کے پیچھے آپ کا کیا مقصد تھا۔ ظاہر ہے یہ مقصد تو قطعی نہیں تھا کہ اپنے موضوع کا قدرِ وسعت، گہرائی اور دیانت داری سے مطالعہ کیا جائے، جیسا کہ آپ کے کل ماخذوں کی اس فہرست سے ظاہر ہے، جو شروع میں درج کر چکا ہوں اور آپ کے حافظے پر بھروسا نہ کرتے ہوئے آخر میں پھر درج کرتا ہوں؛

1۔ نجم الغنی: تاریخِ اودھ

2۔ شرر: گذشتہ لکھنؤ

3۔ شوق: مثنویاں

4۔ پروفسر آل احمد سرور

5۔ پروفیسر خورشید الاسلام

آپ کا

نیّر مسعود

ادبستان، دین دیال روڈ، لکھنؤ 226003

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی جولائی 1998، صفحہ 23 تا 29)

... پروفیسر نیر مسعود نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''منتخب مضامین'' میں اس مضمون کو 'خواہش زدہ تحقیق' کے عنوان سے شائع کیا ... مضمون اس کتاب میں صفحہ 199 تا 213 کو

محیط ہے۔اس کتاب کو پہلی مرتبہ 2009 میں، زیر اہتمام ’آج کی کتابیں‘ ،’سٹی پریس بک شاپ 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400 سے شائع کیا گیا۔منتخب مضامین والے مضمون کے آخر میں پروفیسر نیر مسعود نے صفحہ 211 پر بریکٹ میں لکھا (جمعہ یکم مئی 1998 کو بذریعہ رجسٹری شاہ جہاں پور بھیجا گیا) ساتھ ہی مضمون کے اختتام کے بعد ایک ضمیمہ بھی لگایا جو اس طرح ہے:

ضمیمہ

[مندرجۂ بالا مضمون خط کی صورت میں رسالہ ایوانِ اُردو، دہلی (جولائی 1998) میں شائع ہوا تھا۔اس کا عنوان ’بہ نام رشید حسن خاں‘ (بہ حوالۂ مضمون ’’مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے‘‘) تھا۔

اب اس کو بدل کر ’’خواہش زدہ تحقیق‘‘ (بہ نام رشید حسن خاں) کر دیا گیا ہے۔رشید حسن خاں کا مندرجہ ذیل خط میرے مضمون کے چھپنے سے پہلے لکھا گیا تھا (میں نے انھیں اپنے مضمون کی نقل بھیج دی تھی)۔اگرچہ انھوں نے اپنے خط میں عام اشاعت کی اجازت نہیں دی تھی، لیکن زہرِ عشق پر ان کا مضمون خلافِ وعدہ ان کی کتاب میں من وعن شامل ہوا ہے، اس لیے میں نے اس خط کو بھی اپنے نام ان کے خطوں (سہ ماہی اُردو ادب، نئی دہلی، جنوری، مارچ 2007) میں شامل کر لیا، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ خاں صاحب نے اس مضمون کو ازسرِ نو لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

اس وقت تک مجھ کو صحیح اندازہ نہیں تھا کہ رشید حسن خاں اپنے اوپر اعتراضوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔میرے نام اس خط میں ان کا لہجہ لجاجت آمیز ہے اور انھوں نے میرے کسی اعتراض کا جواب نہیں دیا لیکن اپنے حلقۂ احباب میں کچھ ایسی باتیں کہیں جن سے مجھے تکلیف پہنچی لیکن اس وقت تک وہ انتقال کر چکے تھے اس لیے میں ان سے شکایت بھی نہیں کر سکا۔اب ان کا خط اس ضمیمے کے طور پر شامل کر رہا ہوں تا کہ اصل صورتِ حال واضح ہو جائے۔(نیر مسعود)]

’’شاہ جہاں پور

2 مئی 1998

برادرم!

ابھی آپ کے دو خط ملے۔شکریہ۔

ضروری باتیں: (1) نوری نام کے شعرا سے تو واقفیت تھی، یہ معلوم کرنا تھا کہ صاحبِ دیوان کون ہے؟ میر حسن نے نوری کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔اُردو کے دونوں شاعر بس دو ایک شعروں کے مالک ہیں، ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا کسی کو علم نہیں۔فارسی میں کوئی صاحبِ دیوان ہے؟ (ویسے میر صاحب کی مراد اُردو والوں ہی سے ہوگی۔)

(2) نور باغ کے لیے بس یہی لکھا جاتا ہے کہ ہوگا ضرور مگر احوال معلوم نہیں۔(3) رہے کالے پیادے، تو حبشی دستے والی بات لگتی ہوئی ہے۔کیا یہ بات آپ کے حوالے سے لکھی جا سکتی ہے؟ بر لاس مرزا کا حوالہ میں نہیں دینا چاہتا۔انھوں نے تو بہت کچھ لکھا ہے۔کراچی میں ان کی ایک کتاب دیکھی تھی۔اب اس کے محتویات سب ذہن میں بھی نہیں۔

ایک نئی بات: بے نظیر کی شادی دھوم سے ہوئی، اُس نے پھر ویسی ہی دھوم دھام سے وزیر زادی کی شادی کی:

دقیقہ	نہ	چھوڑا	کسی	بات	میں
برابر	رکھی	چُہل	دن	رات	میں

کیا لکھنؤ میں ’’چُہل برابر رکھنا‘‘ کبھی مستعمل رہا ہے؟ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔چہل کے ایک معنی چہل پہل بھی لکھے ہیں ایک لغت میں حوالے کے بغیر۔میری غرض یہاں اس کے محاورہ ہونے یا نہ ہونے سے ہے۔

یہ باتیں یہاں ختم ہوئیں۔

دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔مجھے اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہ آتی۔میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے۔یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔میں نے دہلی خط ابھی لکھا ہے میں نہیں چاہتا کہ وہاں اور بحث بڑھے۔یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔میں نے دہلی خط ابھی لکھا ہے۔میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اس حصے کو ازسرِ نو لکھوں گا، تا کہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاسداری بھی ہو جائے۔آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا ہے اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بر وقت بات سامنے آ گئی اور بہ آسانی اسے بنایا جا سکتا ہے۔میں غیر ضروری بحثوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا کہ یہ علمی کاموں کے لیے ناسازگار رہا کرتا ہے۔آپ اپنے احباب سے اس خط کے حوالے سے یہ سب باتیں کہہ سکتے ہیں؛ البتہ خط یہ صرف آپ کے لیے ہے۔اب آپ اس پر غور کر لیجیے کہ جب اُسی تحریر کو ازسرِ نو لکھا جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں اور فضول باتوں سے ان کی آرایش کی جائے۔ایسی باتیں بہت جلد

جانتے ہیں کہ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔خیر،حساب دوستاں دردل۔اس پر پھر کبھی بات ہوگی تنہائی میں بیٹھ کر۔میں نہیں چاہتا کہ اغیار اس بحث میں شریک ہوں یا لطف لیں۔آپ اس پہلو پر غور کر لیجیے۔مخمور کو بہ آسانی دوسرا خط لکھ کر آپ منع کر سکتے ہیں۔وہ بھی نہیں چاہیں گے کہ خواہ مخواہ کی اختلافی بحث کا وہ نشانہ بنیں۔تحریر بہ ہر طور انھوں نے چھاپی ہے۔اگر اب تک آپ کا غصہ کچھ کم ہو گیا ہو تو خوب ہو۔میری تجویز آپ مان ہی لیجیے۔ہاں بھائی، یہ خط میرے آپ کے درمیان ہے اور قطعی طور پر ذاتی ہے۔اس کے بس ضروری اجزا کا آپ بلا تکلف حوالہ دے سکتے ہیں، مگر خط آپ کی نظروں کے لیے ہے۔

آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔

ہاں، جون تو مجھے بھی راس نہیں آئے گا، بمبئی جانا ہے۔اس لیے جو ہونا ہے وہاں مئی ہی میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ورنہ پھر بمبئی سے آنا پڑے گا اور اس میں بہت دقت ہوگی۔صائمہ بٹیا سے کہیے کہ کھانا بمبئی سے واپسی پر کھاؤں گا، پھر زیادہ بھی کھا سکوں گا اور بد پرہیزی بھی کر لوں گا۔اس بار تو بس صبح آ کر شام کو واپسی ہوگی، رکوں گا نہیں۔یہاں بھی بعض معاملات ہیں۔آپ سے جلسے میں تو ملاقات ہوگی ہی، میں اسٹیشن سے سیدھا جلسے میں آؤں گا اور وہاں سے بس اڈّے پر تاکہ جلد تر گھر پہنچ جاؤں۔مثنوی کی مطبوعہ اشاعتیں بھی پھر دیکھوں گا، اس بار نہیں، غالباً بمبئی سے واپسی پر۔

خط فوراً لکھیے، اگر چہ عشرے کا زمانہ ہے، پھر بھی۔

رشید حسن خاں''

(منتخب مضامین، نیر مسعود، زیرِ اہتمام، آج کی کتابیں، سٹی پریس بک شاپ، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400، پہلی اشاعت 2009، صفحہ 211 تا 213)

نوٹ۔ایوانِ اُردو، دہلی کے جولائی کے شمارے میں پروفیسر نیر مسعود کے مضمون کے شائع ہونے کے بعد ادبی حلقوں میں بحث ومباحثوں کا دور شروع ہوا کہ رشید حسن خاں جیسے سنجیدہ محقق کو کیا لکھنؤ کی تہذیب ومعاشرت کے تعلق سے مضمون تحریر کرنا چاہیے تھا یا نہیں؟ اس پوری بحث کو میں نے ضمویوں کے طور پر اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

☆☆☆

نیّر مسعود

مصطلحاتِ ٹھگی

'ٹھگ' کا لفظ اُردو میں اپنے اصطلاحی معنی سے مختلف معنوں استعمال ہونے لگا ہے۔اصطلاحی معنی میں 'ٹھگوں کا خواص ہے کہ مسافر کو مارے بغیر اس کا مال اپنے اوپر حرام جانیں' لیکن اُردو محاورے میں ٹھگی کے ساتھ قتل وخون کا تصور نہیں ہے بل کہ دھوکا یا لالچ دے کر کسی کا مال یا منافع حاصل کرنا ہے۔مثلاً نقلی یا کم قیمت مال کو اصلی اور قیمتی بنا کر مہنگا فروخت کر دینا یا زیورات کو دوگنا کر دینے کا دعوا کر کے ہتھیا لینا۔لیکن اصلی ٹھگ میں شکار کا خون کر دینا ضروری تھا۔ٹھگوں کے بڑے بڑے گروہ مسافروں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ لیتے تھے۔ان کی ایک مخصوص تنظیم، رسوم ومعتقدات اور بولی تھی۔یہ بہت راز دارانہ طریقے سے کام کرتے تھے اس لیے ان کی سرگرمیاں عام طور پر صیغۂ راز رہتی تھیں۔

ٹھگی کے خاتمے کے بعد تک ان لوگوں متعلق معلومات عام نہیں تھی، خصوصاً اُردو والوں کو ان کے متعلق بہت کم علم تھا، حالاں کہ اُردو میں 'مصطلحاتِ ٹھگی'، 'واقعات عجیبہ وغریبہ' وغیرہ انیسویں صدی میں لکھی جا چکیں تھیں۔اُردو میں ٹھگی پر فلپ میڈوز ٹیلر کے ناول 'کنفشنس آف اے ٹھگ' کے اُردو ترجموں نے عام اُردو دنیا کو ٹھگوں کی تنظیم اور ان کے طریقِ کار سے روشناس کرایا۔یہ ایک ٹھگ امیر علی کی داستانِ حیات کے طور پر لکھی گئی ہے۔اس کے کئی ترجمے ہوئے۔ان میں حسن جعفری کا ترجمہ غالباً سب سے مکمل ہے جو ایک بار پھر 1998 میں چھپا۔اس پر مترجم کے علاوہ آصف فرخی کا بھی مفید دیباچہ ہے۔

ٹھگوں کا استیصال کرنل ولیم ہنری سلیمن نے کیا۔اس نے مختلف ٹھگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی تنظیم کے بارے میں معلومات اور ان کی مخصوص بولی کے لفظوں کو جمع کیا۔اس کی کتاب 'رماسیانا' ٹھگوں کے متعلق معلومات کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔اس کے کہنے پر علی اکبر الہ آبادی نے ٹھگوں کے مصطلحات پر اُردو فارسی میں کتابیں لکھیں۔رشید حسن خاں نے ان کتابوں سے اپنا متن تیار کیا جو 'مصطلحاتِ ٹھگی' کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔

ٹھگوں کی ابتدا تاریخ کے دھندلکے میں ہے۔ان کی روایتوں کے مطابق کالی دیوی نے ایک بھکاری کو ٹھگی کی تعلیم دی تھی، وہیں سے ان کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ٹھگ ہندو ہوں یا مسلمان، کالی کو اپنی دیوی مانتے تھے، اسی کے ساتھ اپنے ذاتی مذہب پر بھی کاربند رہتے تھے، چناں چہ بہت سے مسلمان ٹھگ روزے نماز کے پابند تھے۔ابتدا میں ٹھگوں کی سات ذاتیں تھیں، انھیں سے چوراسی فرقے پیدا ہوئے جن میں سے کچھ نام یہ ہیں:

اکڑیئے، جمالدی، دکھنی، بنگالی، سوسیا، کویلیا، سندوسی، بڑاڈی، لودھا، تلنگانی مٹھیا، بنگو، بلوچی، میگھپنا، پنجابی، اجینی، پیچ بھیے، کرناٹکی، شولاپوری، بھور سوٹے، تندل، کورہریا، تین، نامی، ارکاٹی، اگریّہ، راموسیا، سوبڑیا، سندھی، ملتانی، جوگی، چڑیاپوتی، چنگڑے، مٹھوال، ڈھولانی، کاچنی، سینگی، والے، کاٹھر، انتربیدی۔

مسافروں کو مارنے کا عام طریقہ رومال سے اس کا گلا گھونٹ دینا تھا، لیکن کبھی تلوار، خنجر وغیرہ سے بھی کام لیا جاتا تھا۔مٹھوال ٹھگ مسافروں کو زہر دے کر مارتے تھے۔ٹھگ عام مسافروں کے بھیس میں دوسرے مسافروں کے ساتھ شامل ہو جاتے اور مناسب موقع پا کر اپنا کام کر گزرتے تھے۔بعض ٹھگ بیوپاری، پنڈتوں، ویدوں، ملاحوں کے بھیس میں بھی واردات کرتے تھے۔ہر کام کے لیے الگ الگ لوگ مقرر تھے، مثلاً مسافروں کا پتا لگانے والے، مارنے والے، لاشوں کو دفن کرنے والے وغیرہ۔شگون ان کے یہاں ہوتے تھے۔مختلف پرندوں، جان وروں کی آوازوں کی سمت وغیرہ سے شگون لیا جاتا اور شگون کے بغیر وہ ٹھگی کی کوئی واردات نہیں کرتے تھے۔کچھ لوگوں کا مارنا ان کے یہاں سخت منع تھا مثلاً عورت، جوگی، تیلی، دھوبی، سنار، فقیر، چمار، کوڑھی، نکٹا، لنگڑا، بولا، اندھا وغیرہ۔بعد کے ٹھگوں نے لالچ میں آ کر ان ممنوعہ لوگوں کو بھی مارنا شروع کر دیا اور بوڑھے ٹھگوں کا خیال تھا کہ ٹھگی کا زوال دیبی کے احکام کی انھی خلاف ورزیوں کا نتیجہ تھا۔

ان کی مخصوص زبان 'رماسی' تھی جس کی فرہنگ 'مصطلحاتِ ٹھگی' ہے۔اس میں صرف لفظوں اور اصطلاحوں کے معنی ہی نہیں دیے گئے ہیں بل کہ ان کے ذیل میں ٹھگوں کے مراسم، اعتقادات، شگون، فرقوں وغیرہ کے متعلق اہم معلومات بھی دی گئی ہیں۔ان کی زبان میں بعض لفظ مختلف جماعتوں میں مختلف معنی رکھتے تھے۔مثلاً:

''پھڑ: کرناٹکی وشولاپوری ٹھگوں کی زبان میں اس جمعدار کی سرداری کے حق کو کہتے ہیں جس کے ساتھ گھر سے سفر کو نکلے ہوویں....ہندوستانی ٹھگ و جمالدی پھڑ فرودگاہ کو کہتے ہیں''۔

اور کبھی ایک ہی مفہوم کے لیے مختلف جماعتوں میں مختلف لفظ تھے، مثلاً:

''دنتیرو: دکھنی ٹھگوں کی زبان میں گدھے کی آواز کے شگون کو کہتے ہیں.....اور 'دنتیرو' کو دکھنی ٹھگ 'ڈنڈا' بھی کہتے ہیں اور ہندوستانی ٹھگ 'کانتا' اور 'گھرکا' کہتے ہیں''۔

ان کے اپنے ضرب الامثال بھی تھے، مثلاً:

''سوپنکھیرو، ایک دنتیرو'' (سو پرندوں کے برابر ایک گدھے کا شگون ہے)۔یا

''راتیں بولے تیترا دن کو بولے سیار، تج چلیے وہ دیس رانہیں پڑے اچانک دھار'' (رات کو تیتر یا دن کو سیار بولے تو وہ شہر چھوڑ دیجیے نہیں تو اچانک آفت آ جائے گی)۔

اس میں شک نہیں کہ ٹھگ ہندوستان کی سب سے بھیانک جرائم پیشہ قوم تھی، لیکن شاید اتنی نہیں جتنی سلیمن کی تحریروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ان تحریروں کا ایک مقصد یہ جتانا بھی تھا کہ انگریزوں نے ٹھگی کا خاتمہ کر کے ہندوستان کو ایک بڑی مصیبت سے نجات دلا دی۔سلیمن نے بہت سے ٹھگوں کو وعدہ معاف گواہ بنا کر ان کے بیانات قلم بند کیے تھے، ان کی بولی کے متعلق بھی معلومات کا ماخذ یہی ٹھگ سچائی تھی اور کس حد تک زیبِ داستان عناصر اور سلیمن نے کس حد تک دیانت داری کے ساتھ ان کو لکھا، اس کا فیصلہ کرنا اب شاید ممکن نہیں ہے (ایک خیال یہ بھی ہے کہ ٹھگ انگریزی اقتدار کے مخالف)۔ان بیانات کو من وعن تسلیم نہیں کر لینا چاہیے، لیکن بہر حال ٹھگی کے متعلق ہم اپنی معلومات کے لیے سلیمن ہی کے مرہونِ منّت ہیں۔

....

رشید حسن خاں نے اس فرہنگ کو حسبِ معمول بہت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔انھوں نے اس کے دستیاب نسخوں کی مدد سے وہ سب الفاظ بھی اپنی ترتیب میں شامل کر لیے ہیں جو کسی اڈیشن میں تھے، کسی میں نہیں تھے۔حواشی میں مولوی ظفر الرحمٰن کی 'فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں' سے بھی کام لیا گیا ہے حالاں کہ اس کا ماخذ بھی 'مصطلحاتِ ٹھگی' ہی ہے اور مرتّب کی صراحتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر الفاظ کے سلسلے میں 'اصطلاحات' کے اندراج غلط ہیں۔'مصطلحاتِ ٹھگی' کے بارے میں رشید حسن خاں کا یہ کہنا صحیح ہے:

''ٹھگ پھانسی کا رومال مقتول کے گلے میں کیسے ڈالتے تھے، ٹھگ بننے کے لیے کس طرح کی تربیت ضروری تھی، کن رسموں کی بجا آوری لازمی تھی اور سب

ہے، یہ کتاب واحد بنیادی ماخذ ہے اس ساری معلومات کے حصول کا۔ اس بنا پر یہ ضروری سمجھا گیا کہ اس کتاب کے متن کو تدوین کے طریقۂ کار کے تحت مرتب کیا جائے۔ سماجیاتی مطالعے، لسانیاتی تجزیے اور لغت نگاری، ان تینوں اہم موضوعات کے لیے یہ کتاب بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، یوں اس کا مرتّب کیا جانا ایک ضروری کام تھا''۔

کتاب میں فارسی کے اقتباسات کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے جو ضروری تھا لیکن بعض جگہ ترجمہ نہیں دیا ہے، مثلاً 'سری دِن' کی خاصی طویل تشریح فارسی میں دی گئی ہے، 'دھرائی' کے سلسلے کا اقتباس بھی طویل ہے، اس کا بھی ترجمہ ہونا تھا۔ کتاب کے ماخذ یہ ہیں:

1۔ رماسیانا: سلیمن نے یہ کتاب 1835 میں مرتب کی تھی۔ 1836 میں یہ کلکتے سے شائع ہوئی۔ ٹھگوں سے متعلق اس کی حیثیت انسائیکلو پیڈیا جیسی ہے۔ ایک بڑا کام سلیمن نے یہ کیا ہے کہ عدالت میں ٹھگوں نے مقدمات کے سلسلے میں جو بیانات دیے ہیں ان سب کو یک جا کر دیا ہے..... سلیمن نے ٹھگوں کی زبان کی جو فرہنگ تیار کی تھی وہ بھی اس میں شامل ہے۔ سلیمن نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ مختلف 'جینٹل مینوں' کی موجودگی میں وہ گویندوں سے پوچھ پوچھ کر الفاظ جمع کرتا رہا ہے۔ اس نے مزید وضاحت کی ہے کہ اس فرہنگ کا لفظ 'رماسی' (ٹھگوں کی خفیہ زبان) ہے''۔

2۔ 'مصطلحاتِ ٹھگی': پہلی روایت: علی اکبر الہ آبادی جبل پور کی 'کچہری جنرل سپرنٹنڈٹی' میں سر شتے دار تھے۔ انھوں نے سلیمن کے کہنے پر ٹھگوں کی زبان سے متعلق ایک کتاب مرتب کی۔ انھوں نے اس کے مقدمے میں مزید صراحت کی ہے ''بالمقابلے' جناب کرمت انتساب کے (مراد ہے سلیمن) کہ آپ بھی انگریزی میں تحریر کرتے جاتے تھے، تحقیق کر کے ایک رسالہ بہ ترتیب حروفِ تہجی کے سب لغات مجتمہ سات سو چالیس ہیں، لکھا و نام اس کا 'مصطلحاتِ ٹھگی' رکھا'۔ یہ پہلی روایت 1836 میں مرتب ہوئی۔

3۔ ''مصطلحاتِ ٹھگی کی روایت ثانی، علی اکبر نے روایتِ اوّل میں بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا ہے، مقدمہ ازسرِ نو لکھا اور اس طرح اس کتاب کی دوسری روایت مکمل ہو گئی جو 1839 میں کلکتے میں چھپی''۔

4۔ ''مصطلحاتِ ٹھگاں: سلیمن کے حکم کے مطابق علی اکبر الہ آبادی نے سلیمن کی مرتبہ فرہنگ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ مترجم کی وضاحت کے مطابق ستمبر 1834 میں یہ ترجمہ کیا گیا...... اس میں الفاظ کی تعداد نسخۂ فرہنگ سلیمن سے کم ہے، مگر بعض ایسے الفاظ کا اضافہ ہے جو نہ تو فرہنگ سلیمن میں سے کم ہے، مگر بعض ایسے الفاظ کا اضافہ ہے جو نہ تو فرہنگ سلیمن میں ہیں اور نہ مصطلحات کی کسی روایت میں.... سلیمن نے 'رماسیانا' کی ترتیب 1835ء میں مکمل کی تھی اور اس فارسی ترجمے کی تسوید ستمبر 1834 میں ہوئی''۔

چاروں نسخوں کے الفاظ کی تعداد ہے؟ فرہنگِ سلیمن (مشمولۂ رماسیانا) 668، مصطلحاتِ ٹھگی کی روایتِ اول (مخطوطہ) 740، مصطلحاتِ ٹھگاں (فارسی) 558، مصطلحاتِ ٹھگی کی روایتِ ثانی (مطبوعہ نسخہ) 1585۔

ان تصریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ٹھگی کی مصطلحات کی یہ فرہنگ دراصل علی اکبر کا نام ہے اور سلیمن کی حیثیت مترجم یا شریک مرتب کی تھی۔ رشید حسن خاں نے اپنی ترتیب میں ان چاروں نسخوں کے سب الفاظ شامل کر کے کتاب کو زیادہ جامع بنا دیا ہے۔

بہت سے لفظوں خصوصاً جرائم پیشہ لوگوں کے مخصوص لفظوں کی طرح ٹھگوں کے بھی بیش تر لفظوں کو اُردو لغات کے مرتبین نے قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ ہمارے لغات کی بڑی کوتاہی ہے۔ کسی زبان میں استعمال ہونے والا ہر لفظ عام اس سے کہ وہ کن لوگوں میں یا کتنا بولا جاتا ہے، لغت میں جگہ جگہ پانے کا مستحق ہے۔ مصطلحاتِ ٹھگی کی دوبارہ اشاعت اور وہ بھی اس قدر عمدہ تدوین کے ساتھ اشاعت کے بعد امید ہے کہ کم از کم ٹھگوں کے مخصوص الفاظ ہمارے لغات میں جگہ پائیں گے۔ یہ محض فرہنگ نہیں ہے قاری اس کے مطالعے سے ٹھگوں کی پُر اسرار دُنیا میں داخل ہو جاتا اور ان عجیب و غریب سفّاکوں کے ساتھ بھی وقت گزار لیتا ہے۔ اس طرح اس کا مطالعہ بہت دل چسپ، کہیں کہیں میڈوز ٹیلر کے ناول سے بھی زیادہ دل چسپ ہو جاتا ہے۔

کتاب کا انتساب ''عصرِ حاضر کے ادبی ٹھگوں کے نام'' بُرے کرداروں کے نام کتاب کا انتساب اُردو کی عام ادبی روایت نہیں ہے۔ لیکن ٹھگی ایک فن تھا۔ مرتب نے غالباً یہ سوچا کہ اس فن پر کتاب کو زیادہ بڑے فن کاروں کے نام معنون کرنا غلط نہ ہوگا۔

(سہ ماہی اُردو ادب، اکتوبر نومبر دسمبر، 2003، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، ص 165 تا 170)

☆☆☆

رشید حسن خاں خطوں کے آئینے میں
(رشید حسن خاں کے خطوط نیّر مسعود کے نام)

رشید حسن خاں سے میری مراسلت 1975 سے شروع ہوئی جب انھوں نے میرے والد کی تعزیت میں مجھے خط لکھا۔ کچھ دن بعد وہ لکھنؤ میرے گھر پر بھی تعزیت ادا کرنے آئے لیکن میں کہیں گیا ہوا تھا، ملاقات نہ ہو سکی۔

خط و کتابت میں تیزی اس وقت آئی جب انھوں نے 'فسانۂ عجائب' کی تدوین شروع کی۔ اسی زمانے میں ان سے دہلی میں بالمشافہ ملاقات ہوئی۔ اسی ابتدائی زمانے کے حالات میں ان کے شخصی خاکے (مطبوعہ 'اظہار' بمبئی، جنوری 1984) میں لکھے ہیں۔

وہ خط لکھنے میں تیز وسخت اور خطوں کا جواب دینے میں پابند تھے۔ میری بچیاں صائمہ اور ثمرہ ان کو تہنیتی کارڈ وغیرہ بھیجتی تھیں۔ ان کو بھی باقاعدگی سے جواب لکھتے تھے۔ (وہ خط ''خان چاچا'' کے نام سے علاحدہ چھاپے جا رہے ہیں)۔

ابتدائی زمانے کے کچھ خطوں کے اقتباس میں نے مذکورہ بالا خاکے میں دیے ہیں۔ اصل خط انجمن ترقی اُردو (ہند) کو دے دیے گئے تھے۔ اب رشید حسن خاں کے جو خط میرے پاس موجود ہیں وہ 2/ مارچ 1991 سے شروع ہوتے ہیں۔ اگست 1992 سے جنوری 1996 تک کے کچھ خط غالباً تلف ہو گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے 'مثنویاتِ شوق' پر کام شروع کیا تھا اور خط زیادہ تر اسی سلسلے کے تھے۔

میرے نام رشید حسن خاں کا آخری خط 30/ مئی 2003 کا ہے جو انھوں نے صائمہ کی شادی کا دعوت نامہ ملنے پر لکھا تھا۔ میری چھوٹی بیٹی ثمرہ کو انھوں نے 6 جنوری 2006 کو خط لکھا۔ اس کے دوسرے مہینے رشید حسن خاں کی وفات ہو گئی۔

میرے پاس موجود ان کے سارے خط زیرِ نظر مضمون میں شامل ہیں۔ ان میں 2/ مئی 1998 کا وہ خط بھی ہے جو انھوں نے 'مثنویاتِ شوق' پر اپنے مضمون اور اس پر میرے اعتراضی مضمون کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اس خط کو میں تھوڑے تامل کے ساتھ شائع کر رہا ہوں اس لیے کہ انھوں نے لکھا تھا کہ یہ خط صرف میری نظروں کے لیے ہے۔ لیکن اسی خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس مضمون کو پھر سے لکھنا چاہتے تھے۔

اس کی روداد یہ ہے کہ رشید حسن خاں نے 'مثنویاتِ شوق' پر اپنے مقدمے کا وہ حصہ جو لکھنوی معاشرت سے متعلق تھا، 'مثنویاتِ شوق۔ لکھنوی معاشرت کے آئینے میں' کے عنوان سے ماہ نامہ 'ایوانِ اُردو' (نئی دہلی) کے اپریل 1998 کے شمارے میں شائع کرایا۔ یہ مضمون کسی بھی طرح ان کے سے ذمے دار محقق کے شایانِ شان نہیں تھا اور اس میں قریب قریب ہر قسم کی تحقیقی اور تنقیدی بے راہ روی اختیار کی گئی تھی۔ میں نے اس کی کچھ بہت نمایاں خامیوں کا جائزہ لیا اور اسے یکم مئی 1998 کو ''بہ نام رشید حسن خاں (بہ حوالۂ مضمون مثنویاتِ شوق۔ لکھنوی معاشرت کے آئینے میں)'' کے عنوان سے 'ایوانِ اُردو' میں چھپنے کو بھیج دیا۔ میں نے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ کیا ان کا یہ مضمون اسی صورت میں ان کی مرتب کردہ 'مثنویاتِ شوق' میں شامل ہوگا؟ خاں صاحب نے فوراً جواب دیا، اپنے مضمون کو پھر سے لکھنے کا وعدہ کیا اور خواہش کی کہ میں 'ایوانِ اُردو' کی مدیر مخمور سعیدی صاحب کو خط لکھ دوں کہ وہ میرا مضمون شائع نہ کریں۔ انھوں نے کتاب کے ناشر کو بھی خط لکھ دیا کہ ان کے مضمون کو روک لیا جائے کیوں کہ وہ اسے از سرِ نو لکھیں گے۔ یہ خط مجھے 5/ مئی کو مل گیا اور میں نے اسی دن مخمور صاحب کو ممانعتی خط لکھ دیا اور رشید حسن خاں کو اس کی اطلاع کر دی۔ خاں صاحب کے کہنے پر 21 مئی 1998 کو میں نے مخمور صاحب کو یاد دہانی کا ایک اور خط لکھا کہ میرا مضمون شائع نہ کیا جائے۔ لیکن جولائی 1998 کے 'ایوانِ اُردو' میں دیکھا کہ میرا مضمون شامل ہے۔ میں نے مخمور صاحب کو احتجاجی خط لکھا۔ انھوں نے یہ خط اپنے جواب کے ساتھ چھاپا۔ خاں صاحب نے خیال ظاہر کیا تھا کہ مخمور صاحب اپنے رسالے میں شائع ہونے والے مضمون پر اختلافی بحث کا نشانہ بننا پسند نہ کریں گے، لیکن مخمور صاحب نے اپنے جواب میں لکھا کہ چوں کہ خاں صاحب کا مضمون 'ایوانِ اُردو' میں چھپا تھا اس لیے اس پر ایرادات بھی اسی رسالے میں چھپنا ضروری تھے۔ اُدھر انجمن ترقی اُردو سے 'مثنویاتِ شوق' چھپ کر آ گئی۔ وہاں خاں صاحب کی ممانعت پر دھیان نہیں دیا گیا تھا۔ ان کا مضمون کسی ردوبدل کے بغیر اپنی سابقہ صورت میں شاملِ کتاب ہے در حالے کہ وہ اسے بدلنا چاہ رہے تھے۔

اسی صورتِ حال کو واضح کرنے کے لیے رشید حسن خاں کا خط شائع کیا جا رہا ہے۔

....

رشید حسن خاں کے سے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے علاوہ ان کے تحقیقی طریقِ کار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ زیرِ تدوین متن کے ایک ایک لفظ کے بارے میں وہ پوری تحقیق

تدوین کرنے والوں میں تھے اور یہی متن ان کا نام زندہ رکھیں گے۔

وہ مالی حیثیت سے مضبوط نہیں تھے اور آخر عمر میں ان کی بیماریاں مہنگے علاج کی طالب تھیں، لیکن خاں صاحب اس کا ذکر نہیں کرتے تھے، البتہ ان خطوں میں اس طرف بھی کہیں کہیں بہت خفیف سے اشارے ملتے ہیں۔

خطوط

شاہ جہاں پور، 2 مارچ 1991

12 مارچ کو منگل کے دن حاضری ضرور دوں گا... اگر صبح تڑکے والی گاڑی مل گئی تو پھر ناشتا آپ کے ساتھ ہوگا، ورنہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پہنچوں گا۔ اسٹیشن سے سید ھادین دیال روڈ، وہاں سے امین آباد اور پھر وہاں سے اسٹیشن۔ یہ سب یوں لکھا ہے کہ آپ (1) صائمہؔ کو مطلع کر دیں (2) ناشتے کا انتظام یا اہتمام احتیاطاً کر رکھیں۔

......

1 میری منجھلی بیٹی صائمہ اور چھوٹی بیٹی ثمرہ کو خاں نے بیٹیاں بنایا تھا۔ دونوں کے نام ان کے خطوط آتے تھے جو میں نے مضمون 'خان چاچا' میں شائع کر دیے ہیں۔ یہ خط اُس مضمون کی تحریر کے وقت موجود تھا، پھر دوسرے کاغذات میں مل گیا اور نہیں ملا۔ خاں صاحب صباح الدین عمر کی عیادت کے لیے آ رہے تھے جن کا مکان امین آباد میں تھا۔ ناشتے کے ذکر کے بعد خاں صاحب نے 'داشتہ آید بہ کار' والی مثل لکھی تھی اور دلاور فگار کا یہ مصرع لکھا تھا:

''زوجہ می آید بہ رکشا داشتہ آید بہ کار''

اور یہ کہ یہ مصرع ایک بڑے ادیب پر صادق آتا ہے۔ (نیّر مسعود)

برادرم نثار فاروقی کا پتا درکار ہے۔ غالباً آپ نے ان سے کہا نہیں تھا۔ اب مجھے خط لکھنا ہوگا۔ عید کی پیشگی مبارک باد۔ اگر رمضان المبارک کی رسم و راہ ہو تو اس کی بھی مبارک باد۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 21 مئی 1991

نیر صاحب، آداب

پرسش احوال کے لیے شکر گزار ہوں۔ یہ خط پلنگ پر نیم دراز لکھ رہا ہوں۔ طبیعت پہلے سے بہتر ہے، مگر نقاہت بہت ہے۔ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اخبار پڑھنے کے سوا۔ بروقت خبر گیری ہوگئی، اس لیے زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ دو ڈھائی مہینے میں شاید ہو پہلے کی طرح ہو سکوں۔ ثمرہ اور صائمہ کو بہت یاد کرتا ہوں۔ ان کے لیے بہت سی دعائیں، ان کی والدہ سے میرا اسلام کہیے۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 13 جون 1991

برادرم، خط مل گیا تھا۔ طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے مگر ابھی تک اس دورِ بے پناہ کے اثرات حاوی ہیں۔ زیادہ چل پھر نہیں سکتا۔ لکھنا پڑھنا بھی بس خط اور اخبارات تک محدود ہے۔ بلڈ پریشر ابھی تک نارمل نہیں ہو پایا ہے۔ بقول ڈاکٹر چھے ماہ تک یہی احوال رہے گا۔ علاج جاری ہے اور رہے گا۔ شارب (ردولوی) صاحب جس دن دیکھنے آئے تھے تو انھوں نے ایک پرچہ بھی دیا تھا جس پر یہ شعر لکھا تھا:

اب دل کے ارادے بھی خطرناک ہوئے ہیں
اک عمر تک اس دل کو ستایا بھی بہت ہے

شعر معمولی، مگر اس موقع پر مزہ دے گیا۔ اس بدعتی پر دراصل بد دعاؤں کا اثر پڑا ہے، مگر خدا کا شکر ہے کہ آئندہ بھی ویسی ہی حرکات کا مصمم ارادہ ہے۔ آپ کا خط پا کر جی خوش ہوا۔ اس ویرانے میں غالبؔ کے اس قول کو مفہوم صحیح طور پر سمجھ میں آیا کہ جس کا خط آیا، میں یہ سمجھا کہ وہ خود آ گیا۔ صائمہ کا خط بھی اسی لفافے میں ملفوف ہے۔ معلوم نہیں کیوں اب آپ سب سے ملاقات کرنے کو جی بہت چاہتا ہے، خدا وہ دن کرے!

یہ آپ نے کیا لکھا کہ فاروقی صاحب کا بھی یہی احوال ہے۔ کیا شرفائے قوم ہی پر براوقت پڑتا رہے گا اور یہ سب حرام زدگانِ ادب محفوظ و مامون رہیں

کچھ کہیے (میں تو ان کو شکایت کا خط لکھنے والا تھا کہ 'شب خون' میں آزاد والے مضمون کا برا احوال بنا اور ایک صفحہ ہی ایک جگہ سے نذرِ تغافلِ کتابت ہو گیا)۔اب آپ ان کے احوال سے بھی ضرور مطلع کیجیے۔

ہاں بھائی! اس بار واقعی سخت جانی نے آبرو رکھ لی ورنہ ضرب تو کاری لگی تھی اور بہ قولِ انیسؔ...کافر نے ہاتھ بھی جنیو کا مارا تھا۔ بے دین کا ہاتھ بس ذرا سا اچٹ گیا۔اس پر شکر تو انھیں اللہ میاں کا ادا کرنا پڑے گا۔آپ بھی اس میں شرکت کر لیجیے تا کہ سامنا ہونے پر کہہ سکوں کہ یہ تو نیر صاحب کی پیروی میں نے کی تھی۔ارے بھائی معاف کرنا، بھول ہی گیا تھا۔بقول آپ حضرات کے ان بزرگوار کا دیدار تو ہوگا ہی نہیں، یوں قصہ ختم سمجھیے۔

میں یکم جولائی کو دہلی جاؤں گا۔چک اَپ کے لیے اسپتال جانا ہے۔نومبر دسمبر تک وہیں رہوں گا۔اب آپ خط ضرور لکھیے گا، گائر ہال کے پتے پر، تا کہ جب میں پہنچوں تو وہاں جا کر ہاتھ خالی نہ رہے اور آنکھیں حیرانی سے دو چار نہ ہوں بل کہ ان کی روشنی کچھ بڑھ جائے۔'باغ و بہار' کے مقدمے کے بس آخری دس صفحے لکھنا تھے کہ یہ حادثہ کار فرما ہو گیا۔اب سب سے پہلے اسی کام کو کرنا ہے۔آپ بھی آمین کہہ لیجیے (مگر بالجہر)

رشید حسن خاں

....

دہلی، 7 جولائی 1991

برادرم! میں 2/جولائی کو دہلی بہ عافیت پہنچ گیا۔طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے، مگر ابھی تک لکھنا پڑھنا باقاعدہ شروع کرنے کی ہمت ہوئی ہے نہ توفیق۔نقاہت کا خاصا اثر باقی ہے۔مجھے سب سے زیادہ فکر 'باغ و بہار' کی ہے۔اس کے مقدمے کا آخری حصہ جو لسانی مباحث پر مشتمل ہے، بس لکھنے کو رہ گیا تھا۔باقی سارا کام مکمل ہو گیا تھا۔جس طرح بن پڑے گا، اگلے ہفتے اسے شروع کروں گا۔

شاہ جہاں پور سے میں نے ایک لفافہ بھیجا تھا۔اس میں صائمہ کے نام کا بھی پوسٹ کارڈ ملفوف تھا۔

آپ کیسے ہیں۔فاروقی صاحب کہاں ہیں۔'شب خون' میں مضمون جو چھپا تو مضمون کے دوسرے حصے کے آغاز کا پورا ایک صفحہ کاتب صاحب کھا گئے۔ویسے بھی اس بار رسالے کی ہیئت بدنما نظر آئی۔معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے۔اپنی خیریت سے مطلع کیجیے۔

ہاں، صباح الدین عمر صاحب کی خیر خبر نہیں مل رہی ہے۔کچھ ان کا احوال تو لکھئے۔

رشید حسن خاں

....

دہلی، 21 جولائی 1991

برادرم! خط مل گیا تھا۔ویسے تو یہ جواب طلب نہیں تھا، مگر اس میں ایک جگہ طاہر تونسوی صاحب کا نام آ گیا ہے اور آپ نے یاد دہانی کرائی ہے۔بھائی! اُن کا ایک خط میرے پاس آیا تھا۔لفافے میں انور سدید صاحب کا لکھا ہوا ایک خط (عکسی صورت میں) ملفوف تھا، جن میں ایک جگہ ان کے ذکر میں میرا بھی نام لکھ دیا گیا ہے مگر اس طرح کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ مراد کیا ہے۔طاہر صاحب کا خیال غالباً یہ ہے کہ میں نے کبھی ان کے تحقیقی مقالے پر اپنی رائے ظاہر کی ہے۔میں نے ان کو جواب لکھ دیا تھا اور یہ آپ کے خط کے آنے سے بس دو چار دن پہلے ہی کی بات ہے۔میں نے لکھا تھا کہ بھائی! میں نے آج تک نہ آپ کو دیکھا ہے نہ آپ کے مقالے کو۔جس چیز کو دیکھا ہی نہیں اس کے متعلق میں رائے کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔میں نے کبھی کچھ نہیں کہا اور نہ لکھا۔اور کیسے کہتا اور لکھتا۔یہ تو اللہ میاں کی ذات ہے کہ اس عالمِ کون و فساد میں کسی نے ان کو دیکھا نہیں۔مگر ہر شخص ان کی ذات کا بیان اس طرح کرتا ہے جیسے ''خدا کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں۔'' مگر کتاب کی بات الگ ہے، اسے جب تک دیکھا نہ جائے، تو اس کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انور سدید میں اور ان میں کچھ کہا سنی ہو گئی ہے، اور میرا نام خواہ مخواہ لکھ دیا گیا ہے، میرا خیال ہے کہ محض تفریحاً۔آپ بھی یہ اطلاع ان کو دے سکتے ہیں۔میں نے واقعتاً ان کا مقالہ آج تک نہیں دیکھا اور کیسے دیکھتا۔ملتا تبھی تو نظر سے گزرتا۔

ہر مہینے چک اَپ کے لیے جانا پڑتا ہے، اس لیے یاد تازہ ہوتی رہتی ہے اور یوں سکون و قرار عنقا ہوتا رہتا ہے۔یہ سلسلہ دسمبر تک تو چلے ہی گا۔آپ نے فاروقی صاحب کے مرض کا ذکر کیا ہے، انھیں کیا ہوا؟ یا کیا ہوا تھا؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔جب عزاداری سے فرصت و فراغت نصیب ہو تو اس کے متعلق بھی لکھیے گا۔ابھی تو آپ بہت مصروف ہوں گے۔

رشید حسن خاں

....

7اپریل1994

برادرم!

'تفہیم' کی ایک جلد رجسٹری سے بھجوائی تھی، کئی ہفتے ہونے کو آئے، رسید نہیں ملی۔ کیا کتاب آپ تک نہیں پہنچی؟ خاص کر یوں پوچھ رہا ہوں کہ یہ کام میں نے ایک صاحب کے سپرد کر دیا تھا، انھوں نے کیا کیا، مجھے نہیں معلوم۔ یہ یقین ہے کہ آپ بہ عافیت ہوں گے۔

رشید حسن خاں

....

4/نومبر1994

برادرم! آپ کہاں ہیں؟ صائمہ کیسی ہیں؟

ضروری بات: جب بکاولی حوض میں پھول نہیں پاتی تو برہم ہوتی ہے، اُس وقت:

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو بر اندام

دوسرے مصرعے میں 'تھی' بھی پڑھ سکتے ہیں اور 'تھے' بھی۔ یعنی یوں بھی:

تھے سبزے سے راست مو بر اندام

اور 'تھی' کی صورت میں 'زمیں' مبتدا ہوگی۔ نسخۂ چکبست و نسخۂ قاضی عبدالودود میں 'تھی' ہے۔ آپ کی رائے میں مرجح صورت کیا ہے؟ جواب جلد تر عناعت ہو۔

رشید حسن خاں

....

یکم جنوری1995

برادرم! آج 'گلزارِ نسیم' چھپنے کے لیے چلی گئی ہے۔ آخری صفحے کا نمبر شمار 724 ہے اِس میں 13 صفحے فارسی متن کے بھی شامل ہیں۔

لوگ کہیں گے بات کا بتنگڑ بنایا ہے کہ 1500 سے کچھ زیادہ اشعار کی کتاب کو گویا یا داستانِ طلسم ہوش ربا کی پہلی جلد بنا دیا۔ کہنے دیجیے، ہوتی ہے۔ کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں۔

اب ضروری بات، مگر پہلے غالبؔ کا یہ مصرع پڑھ لوں:

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں!

آج ہی شام سے 'مثنویاتِ شوق' کا کام شروع کر دیا ہے۔ میرے پاس 'زہرِ عشق'' کا پہلا اڈیشن (1862 کا) ہے، اُس کی نقل تیار کر رہا ہوں اپنے قلم سے۔ بعد کو اختلافات کا گوشوارہ بناؤں گا۔ اب آپ حسبِ وعدہ مندرجۂ ذیل نسخے فوری طور پر بھیجیے:

1۔ فریبِ عشق مطبوعہ 1272ھ (یہ آپ کے یہاں ہے)
2۔ بہارِ عشق مطبع سلطانی، 1266ھ
3۔ ,, ,, مطبع محمدی، 1268ھ
4۔ مجموعۂ مثنویاتِ شوق نول کشور، 1868
5۔ ,, ,, ,, ,, 1871
6۔ زہرِ عشق مرتبۂ مجنوں گورکھپوری (کُل چھے کتابیں)

لذتِ عشق کی ضرورت نہیں۔

بھائی! میری خاطر یہ زحمت بھی گوارا کر لیجیے کہ آج ہی پارسل بنا کر رجسٹری سے بھیج دیجیے۔ اِس کام کو جلد تر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ کیا معلوم کل کیا ہوگا اور کل

ہوگا بھی کہ نہیں [illegible]

واپسی ہوگی۔ کام مکمل ہوتے ہی (حسبِ معمول) کتابیں واپس کردی جائیں گی۔

مخلص

رشید حسن خاں

یہ خط کل نکلے گا اور تین چار دن میں آپ کو مل جائے گا، اگر 10 رتک پارسل مجھے مل جائے تو خوب ہو۔ توقع کرتا ہوں کہ وہ سب مسودہ آپ نے اکیڈمی بھجوا دیا ہوگا۔

....

20 جنوری 1995

برادرم!

ابھی خط ملا۔ دیکھیے صاحب! اگر 'بہارِ عشق' اور 'فریبِ عشق' کے وہ اوّلین اڈیشن نہ ملے تو یہ تو نہیں کہوں گا کہ جس نے چھپا کے رکھے ہوں، اُس پر علیؑ کی تیغ کی مار، کشمیری کو مارا تو کیا مارا! اگر میں پھر سارے ایسے کام مستقلاً ملتوی کردوں گا۔ ارے صاحب! میں نے 'زہرِ عشق' کا متن مکمل کرلیا، اس کا پہلا اڈیشن 1862ء میرے پاس ہے۔ 'بہارِ عشق'' کا میں اپنے قلم سے ایک معتبر مطبوعہ نسخے (مرتبۂ شاہ عبدالسلام) سے نقل کررہا ہوں، حواشی بھی لکھتا جاتا ہوں۔ اب اگر وہ نسخے نہ ملے تو یہ سارا کام چوپٹ ہوجائے گا۔ وہ صاحب لکھنؤ میں ہیں، ملکِ عدم میں نہیں، یوں اُن کے ملنے کا سوال ہی نہیں۔ وہ اصل نسخے رکھ لیں، مجھے اس پر اعتراض نہیں، ان کا عکس ہی دے دیں۔ پھر نسخے آپ کے، نہ دینا چہ معنی دارد! ہاں آپ خود اگر نہ چاہیں تو اور بات ہے۔ دیکھیے نیر صاحب! یہ بات نہ بنے گی اس طرح اور نہ چلے گی اس طرح، نسخے آپ کو حاصل کرنا ہیں، جس طرح بھی ہو، طریقۂ کار آپ جانیں۔ لیکن مجھے وہ نسخے بہ ہر طور ملنے چاہیے۔ میں کل بمبئی یونی ورسٹی میں چار لکچر دینے کے لیے جارہا ہوں، واپسی 29 جنوری کو ہوگی۔ اُس وقت تک آپ اس کام کو بہ ہر طور کر رکھیے۔ یا آپ چاہتے ہیں کہ میں اِس کام کو نہ کروں؟ اگر ایسا ہے تو فبہا، میں اسے تہ کر کے رکھے دیتا ہوں۔ یہ خط جلدی میں لکھ رہا ہوں، جواب بھی اسی طرح جلد تر لکھیے۔

رشید حسن خاں

صائمہ سے جب ملاقات ہوگی تو باقی ہدایات زبانی دی جائے گی، جو زیادہ ضروری ہیں۔

....

2 فروری 1995

حضورِ والا!

رمضان برحق، عبادت و ریاضت بھی مسلم، لیکن اِس زمانے میں آدمی نرا اولیا تو نہیں ہوجاتا۔ دنیا کے کچھ کام تو کرتا ہی ہے؛ پھر آخر خط کا جواب کیوں نہیں ملا۔ میں خود اِس ماہِ مبارک میں ریاضؔ کے اس شعر پر صدقِ دل سے عمل کرتا ہوں:

اُٹھّے کبھی گھبرا کے تو مے خانے کو ہو آئے

پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یادِ خدا میں

تراویح کے نہ آپ قائل اور نہ میں، افطار کے آپ بھی شائق ہوں گے اور میں بھی ہوں۔ ضرورتاً بھی اِن دنوں جھوٹ نہیں بولتا اور ارادتاً کبھی ایسا کام نہیں کرتا جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ جبرِ مشیّت کی بات اور ہے کہ آدمی مجبورِ محض ہے، جو وہ چاہتے ہیں، وہی کرتا ہے، وہ روزہ شکنی کیوں نہ ہو۔

ارے صاحب! 'بہارِ عشق' اور 'فریبِ عشق' کا منتظر ہوں۔ وہ صاحب وہیں لکھنؤ میں ہیں، میری بے چارگی پر رحم کھائیے اور ان دونوں مثنویوں کو کسی بھی طرح حاصل کر کے بھیجیے، خواہ اس کے لیے فوج داری کرنا پڑے۔ عشق میں سب کچھ جائز ہے۔

'زہرِ عشق' کا متن مکمل ہوگیا، یوں کہ اُس کی اشاعتِ قدیم (غالباً طبعِ اوّل) میرے پاس ہے۔ اب حیران و پریشان بیٹھا ہوا ہوں اور اُم غاضب کے لیے دعائیہ کلمات کی تصحیف کرتا رہتا ہوں۔ اِدھر توجہ کیجیے۔ ممنون ہوں یا نہ ہوں، تصحیف کے عملِ مسلسل سے تو نجات پاؤں گا۔ صائمہ کے لیے عید کا کارڈ خط کی صورت میں اِس کے ساتھ ہی بھیج رہا ہوں۔

رشید حسن خاں

9مارچ1995

بھائی صاحب، دو خط لکھ چکا ہوں، جواب ندارد۔ اِسے کیا کہتے ہیں؟

میں ٹھہرا غرض مند، یوں خط نہ لکھوں گا تو کیا کروں گا؛ مگر آپ کی وضع داری پر حرف آئے گا، اُس کا کیا ہوگا!

آپ نے اپنے پُرانے خط مرقومہ 3؍جنوری میں لکھا تھا: ''شوق کی یہ دو مثنویاں ہنوز میرے پاس موجود ہیں: 'فریبِ عشق' (کرم خوردہ) مطبع آغا جان 1272ھ۔ 'بہارِ عشق'؛ مطبع گلزارِ اودھ، 1283ھ''

اب پہلے تو آپ اِنھی دونوں کو رجسٹری سے بھیج دیجیے۔ پھر بقیہ کا انتظام کیجیے۔ خدا کرے میرا یہ خط جس دن ملے، اُسی دن آپ اِن دونوں مثنویوں کو روانہ کر دیں اور پھر اُس کے دوسرے دن ان آغائے کشمیری کے چنگلِ غضب سے باقی نسخوں کو نکال کر بشارت دیں۔

رشید حسن خاں

صائمہ کو بھی خط عید کی مبارک باد کا بھیجا تھا آپ کے خط کے ساتھ۔

....

29مارچ1995

مثنویوں کے دونوں نسخے مل گئے۔ جی خوش ہوا۔ اِس طرح ابتدائی سطح پر کام تو شروع ہو سکے گا اور شروع ہو بھی گیا ہے۔

خلیق انجم صاحب سے 'امراؤ جان' کی بات کی تھی، اُن کا کہنا ہے کہ قمر صاحب نے صاف انکار کر دیا اُس اڈیشن کی موجودگی سے۔ اب آغا صاحب کا کچھ بگاڑ سکتے تھے؟ نہیں نا، سو یہی احوال اب میرا ہے۔ کہیں اور دیکھوں۔ آپ بھی توجہ کیجیے۔

اب میری داستانِ پریشانی کا تمہیدی حصہ شروع ہوتا ہے۔ اس کی کئی قسطیں ہوں گی (انشاءاللہ)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان المدارس میں چند ماہ کے لیے داخلہ لینا پڑے گا۔ اُس پر بھی غور کروں گا، فی الوقت آپ کو قبلہ و کعبہ مانے لیتا ہوں۔

(1) ''تیغ حق نے، (کذا)۔'' تیغ سے اشارہ ذوالفقار کی طرف ہے۔ اس کے لیے شیعہ عقیدہ یا خیال کیا ہے؟ دائرۃ المعارف میں تو یہ مرقوم ہے کہ جنگِ احد میں یہ ایک کافر کی تلوار تھی، رسول اللہؐ کو ملی اور آپ نے حضرت علی کو دے دی۔ کیا یہ عقیدہ یا روایت ہے کہ یہ عرش سے اُتری تھی، اِسے حضرت جبریل لائے تھے؟

(2) ''ضربِ حیدر سے کانپتے ہیں ملک۔'' کیا اِس میں کوئی تلمیح ہے؟ غالباً دبیر کا شعر ہے:

خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر

دو چار سطروں میں اِس کے متعلق لکھیے۔

(3) 'بھولی حیدر کو پھر نہ یادِ علی
آئی جس روز سے کہ 'نادِ علی' ''

'نادِ علی' کی عبارت کیا ہے، اور تلمیح کیا ہے؟

(4) ''ماسواں کے، کیا یہ اوج ہے کم دوشِ احمد پہ تھے علی کے قدم''

یہ غالباً کعبے میں بتوں کو توڑنے والے سے متعلق ہے، مگر مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔ ذرا سی تفصیل لکھ دیجیے۔

(5) جب کیا فتح قلعۂ خیبر
تھی یہی ذوالفقار زیبِ کمر

اس کی ذرا سی تفصیل۔

(6) مثنوی میں 'کربلا' بار بار آیا ہے مثلاً:

''دوست جتنے تھے رہتے، تھے ہمراہ
کربلا میں کبھی میں کبھی، درگاہ''

نا؛ اِس سے متعلق تاریخِ اودھ' (نجم الغنی) میں تفصیل مرقوم ہے یہ بنی کیسے اور علم کی حقیقت کیا تھی۔

(7) ''اب جو نوچندی ہے رجب کی اخیر، آئی نوچندی بھی رجب کی اخیر''

رجب کی اخیر نوچندی سے کیا مراد ہے، نوچندی تو ہر چاند کی پہلی جمعرات کو ہوتی تھی۔ کیا رجب کی اخیر نوچندی کس خاص واقعے سے متعلق ہے؟

(8) رہتا تھا تیرھویں کا جلسہ یاد شام سے جاتے تھے حسین آباد

''تیرھویں'' سے کیا مراد؟ اور کیا اُس دن حسین امام باڑے میں کوئی رات بھر کا جلسہ ہوتا تھا؟

صاحب! میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو زیادہ داخلِ حسنات ہونے کا ایک موقع فراہم کروں۔ آپ کو تو ثواب ملے اور مجھے معلومات۔ ضمیمہ تشریحات کے لیے اِن سب کی ضرورت ہے۔ 'گلزارِ نسیم' چھپ گئی۔ اس کی ضخامت کی بنا پر ڈاک سے کیا بھیجوں، کسی کے ہاتھ بھیجوں گا، کئی جلدیں بھیجنا ہیں۔ انتساب کے لیے کہہ چکا تھا کہ وہ لکھنؤ کے ایک صاحب کے نام ہے۔ نام کیا لوں، کوئی اللہ کا بندہ ہوگا۔

جواب جلد

رشید حسن خاں

اُس مردود نے انکار کر کے اپنے علاقے کی روایت کی پاس داری کا حق ادا کیا ہے۔ مرتے وقت وہ اوندھا پڑا ہوگا اور شیطان اُس کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو جنت میں بار پالنے والے ایرانی وہاں کے غلمانوں کے ساتھ کریں گے۔ آپ بھی آمین کہیے۔ ایک بار نہیں تین بار پس نوشت ذرا شاہ عبدالسلام صاحب سے تو معلوم کیجیے۔ مجھ سے اُن سے یاد اللہ نہیں، ورنہ خود لکھتا۔

....

گائڑہال، 6 اپریل 1995

نیر صاحب!

میں نے دونوں مثنویوں کی رسید بھیجی تھی اور چند باتیں تھی۔ اُس خط کا جواب تک نہیں ملا۔ منتظر ہوں۔

رشید حسن خاں

....

21 اپریل 1995

برادرم!

کل آپ کا خط ملا۔ ایں ہم غنیمت است۔ اختر صاحب کے آنے کی اطلاع کاظم علی خاں سے مل گئی تھی۔ میرے لیے بھی یہ بات باعثِ مسرت ہے۔ اُن سے میرا سلامِ شوق کہیے مع اشتیاقِ ملاقات۔ خدا وہ دن کرے!

آپ کی بھیجی ہوئی اطلاعات آپ ہی کے الفاظ میں مع حوالہ درجِ کتاب ہوں گی، یوں کہ میں ٹھہرا سُنّی بھی، جلاہا پٹھان، جلاہا نہیں، شیخ جی بھی نہیں؛ یوں ڈرتا ہوں کہ یار لوگ یہ نہ کہیں کہ تم کیا جانو ان اسرار رموز کو۔ 'باغ و بہار' میں میر امن کے لیے میں نے لکھا کہ وہ شیعہ تھے۔ مجاور حسین صاحب نے اپنے تبصرے میں لکھا کہ شیعۂ اثنا عشری لکھنا چاہیے تھا اور شیعہ حضرات کے اقسام لکھے۔ اب بھلا میں اِن باتوں کو کیسے جان سکتا تھا۔

اب پھر وہی رودادِ غم:

مشورہ کر کے ٹھہری یہ تدبیر

اب جو نوچندی ہے رجب کی اخیر

راضی اس پر کرو کہاری کو

کہ اُتروا دے یاں سواری کو

پا گئی جب قرار یہ تدبیر

آئی نوچندی بھی رجب کی اخیر

تو صاحب! یہ 'اخیر' کا لاحقہ محض حشو تو نہیں لگتا۔ اب یہ فرمائیے کہ نوچندی تو ہر ماہ کی پہلی چاند رات کو کہتے ہیں، جمعرات کا دن غالباً شرط ہے اس کے لیے بھی رجب یعنی ایک خاص مہینے کی تخصیص کیوں ہے؟ کیا رجب میں کوئی خاص رات (تقریب ... یادگار وغیرہ) ہوتی ہے کہ اُس کی نسبت سے اس ...

کی نوچندی کو کوئی خصوصیت حاصل ہو۔

مصحفیؔ کا شعر ہے:

نو چندی آئی دھوم سے، چل تو بھی مصحفیؔ
جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

سحرؔ لکھنوی کا شعر ہے:

اِس مہینے کی مبارک ہو مجھے نو چندی
ساتھ درگاہ میں یہ بندۂ درگاہ بھی ہو

تو کیا 'کربلا' اور 'درگاہ' (درگاہِ حضرت عباس) دونوں جگہ یہ مجمعے ہوا کرتے تھے؟ آغا رومی نے 'تاریخ لکھنوی' (کراچی) میں لکھا ہے کہ ہر شیعہ کے لیے ''درگاہ میں نوچندی کو حاضری ضروری تھی''۔ کیا یہ قول درست ہے؟ اور کیا اب بھی اِس پر عمل ہوتا ہے اور کیا اب بھی کربلا بھی درگاہ میں 'ڈولیاں' اترتی ہیں؟

'نادِعلی' میں 'مظہَر العجائب' ہے یا 'مُظہِر العجائب'۔ 'مَظہر' اسم ظرف ہے اور 'مُظہِر' اسمِ فاعل۔

آپ نے میر انیسؔ کا شعر ضرور لکھا (غل تھا علی کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہے) لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ اُن کے کس مرثیے میں ہے۔

میری یادداشت میں ایک اور شعر بھی ہے:

خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغِ دو پیکر نے تین پر

کیا آپ کے ذہن میں اِس سے متعلق کچھ محفوظ ہے کہ یہ کس کا ہے، انیسؔ کا یا دبیرؔ کا۔ یہ شعر تو دبیرؔ کا ہے:

شمشیر بہ کف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہاں 'درگاہ' سے مراد 'درگاہِ دوازدہ امام' بھی ہوتی ہے، کیا وہاں بھی جلسے ہوا کرتے تھے؟

اکبر حیدری صاحب کا خط آیا ہے۔ لکھا ہے کہ میں نے 1992 میں سب کتابیں واپس کردی تھیں، وہیں نکلیں گی۔ ہاں 1266ھ کے نسخے کا عکس بنوالیا تھا، وہ بھیج دوں گا۔ کشمیر جارہا ہوں، واپس آکر۔ اب فرمائیے کیا کشمیر سے کوئی واپس آیا ہے؟ ذرا ایک بار پھر تو 'تلاشی' لے لیجیے اپنے یہاں، شاید اُنھی کا کہنا درست ہو۔ پرسوں ایک لطیفہ پڑھا تھا کسی رسالے میں، آپ بھی سُن لیجیے (اگر نہ سنا ہو): چند عورتیں محوِ گفتگو تھیں۔ ایک نے کہا بہن! جنت میں مردوں کو تو حوریں ملیں گی، ہمیں تمھیں کیا ملے گا؟ دوسری نے کہا: ہمیں کیا ملے گا، وہی ہمارے مردوے ہوں گے۔ پہلی نے کہا: تو پھر جنت میں جانے سے کیا فائدہ؟ جواب فی الفور عنایت ہو۔

رشید حسن خاں

پس نوشت: 'ایوانِ اُردو' کا سال نامہ نکل آیا ہے۔ اُس میں 'گلزارِ نسیم' سے متعلق تحریر ملاحظہ فرمائیں۔

....

5 مئی 1995

ہاں صاحب! خوب اتفاق ہوا کہ 27 کو آپ دہلی پہنچے اور میں 27 ہی کی صبح کی گاڑی سے شاہ جہاں پور کے لیے روانہ ہوا۔ خط آپ کا مل گیا تھا۔

میرا ایک خط جواب طلب ہے۔ 'حیاتِ شوقؔ' (ڈاکٹر سیّد حیدر) سے معلوم ہوا کہ 'بہارِ عشق' کا 1268ھ کا اڈیشن لکھنؤ یونی ورسٹی کی ٹیگور لائبریری میں ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ یہ نہایت درجہ ضروری بات ہے، جس طرح بھی ہو، اس کا پتا لگوائیے۔

''رجب کی اخیر نوچندی'' والے شعر پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں، یہاں فہم عاجز ہے نا!

''حل اَتی' کے متعلق مجھے بس یہ معلوم ہے کہ یہ اہلِ بیت کی شان میں ہے۔ شوقؔ نے لکھا ہے کہ یہ حضرت علیؓ کی شان میں ہے۔ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔ یہاں عموم، خصوص والی بحث معلوم ہوتی ہے۔

گورستان یا مدفن تک لے جایا جائے۔ اور سب سے ضروری بات یہ کہ شوؔق کے بیان کے مطابق (’زہرِ عشق‘ میں) تابوت کے ساتھ عورتیں بھی تھیں (ماں، ماما، مغلانیاں)۔ کیا یہ رواج ہے یا تھا؟ میں نے کہیں نہیں دیکھا نہ سنا اور نہ کہیں پڑھا۔

اب اِس خط کے ساتھ دو خطوں کا جواب واجب الادا ٹھہرا ہے۔

میں کل شاہ جہاں پور سے آیا ہوں۔ اختر صاحب سے میرا سلام کہیے اور صائمہ کو پیار۔

رشید حسن خاں

....

13 مئی 1995

برادرم!

آج طویل انتظار کے بعد آپ کا خط ملا۔ تفصیل سے جی خوش ہوا اور میرا کام آسان ہو گیا۔ جیتے رہیے اور خوش رہیے۔ آپ کا سچّا شیعہ ہونا میرے کام آ رہا ہے۔

دو باتیں لکھنا ہیں اِس خط میں؛ یہ دونوں ضروری ہیں اور توجہ طلب۔ موسم تو کئی مہینے تک ایسا ہی رہے گا، کام کیوں رُکے رہیں۔ میں بہ ہر طور اب اپنے کاموں کو، معلوم نہیں کیوں، جلد تر مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی کی بے ثباتی کا نقش دل پر کچھ گہرا ہونے لگا ہے۔ اگر تصوف کے....کا قائل ہوتا تو شاید اس عمر میں اُس دیوار کے سایے میں پڑا رہتا۔ اب تو چلچلاتی دھوپ ہی میں رہنا ہے اور یوں ہی آتش زیرِ پا۔ کب تک، یہ معلوم نہیں۔ خیر، اس پر مفصل گفتگو زبانی ہوگی۔

ہاں تو وہ دو باتیں: آپ صدر شعبہ ہیں آج کل، یوں ’جنّات‘ کا چھوٹا سا لشکر تو آپ کے قبضے میں ضرور ہوگا۔ اگر چھٹیوں کے زمانے میں، جب کتابیں جاری کی نہیں جاتیں، دیکھ لیا جائے تو آسانی ہوگی۔ اس لیے از راہِ لطف خاص ’بہارِ عشق‘ کی اُس اشاعتِ 1268ھ کو ڈھونڈ والیجیے۔ وہ اور کہیں نہیں ملے گی (آپ کی طرح مجھے بھی آغا کے وعدے کا اعتبار نہیں۔ اُنھوں نے وعدہ کر لیا، یہی کیا کم ہے)۔ آپ کے ایک نیازمند ڈاکٹر سیّد محمد حیدر نے اپنے تحقیقی مقالے ’حیاتِ شوق‘ میں اس کا حوالہ اِس طرح دیا ہے جسے اُسے بہ چشم دیکھا ہو۔ ضروری عبارت بھی نقل کر دی ہے۔ اس سے اُس کتاب کا موجود ہونا تو ثابت ہو ہی جاتا ہے۔

(2) ڈاکٹر سیّد محمود نے اُس مقالے میں آپ کا نیازمندانہ حوالہ دیا ہے؛ یوں اگر آپ اُن کو خط لکھ دیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ کام آ جائیں گے (محاورے میں نہیں، حقیقی معنی میں)۔ انھوں نے اپنی کتاب میں ’زہرِ عشق‘ مرتبہ عشرتؔ رحمانی کا حوالہ دیا ہے، جو لاہور سے 1953 میں شائع ہوئی تھی۔ حوالہ س طرح دیا گیا ہے جیسے وہ نسخہ سامنے ہو۔ اِسی طرح ’زہرِ عشق‘ مرتبہ نظامی بدایونی کا حوالہ دیا ہے جو 1919 میں اور پھر 1921 میں شائع ہوئی تھی۔ مجھے یہ دونوں نسخے کہیں نہیں ملے۔ یہ دونوں تو اُن کے پاس ہوں گے یا پھر وہ جانتے ہوں گے کہ کہاں ہیں۔ ان کے عکس بہ آسانی بنوائے جا سکتے ہیں۔ کتاب میں اُن کا پتا یہ لکھا ہوا ہے:

ٹیرہ نزد زید پور، بارہ بنکی (یوپی)

ملک زادہ صاحب یعنی جہانیاں جہاں گرد ملک زادہ صاحب اِن کے نگراں تھے۔ اگر آپ سیّد صاحب کو خط لکھ دیں گے تو ضرور اثر ہوگا۔ بھائی! اِس کام کو بھی کر ہی دیجیے۔ (ہاں آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ’حیاتِ شوق‘ عاریتاً ڈاکٹر سیّد محمد عقیل رضوی نے الٰہ آباد سے بھیجی ہے استفادے کے لیے۔ اب بھی آپ کہیں گے کہ وفا اُٹھ گئی زمانے سے)۔ پتے کی تصدیق ملک زادہ سے کر لیجیے گا فون پر۔ بڑی بچی کے بخار کا احوال پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ خدائے پاک (اگر وہ ہے کہیں) اِس پیاری بچی کو جلد تر شفا دے۔ صائمہ کو دعائیں۔ اُن سے کہیے کہ قومی زبان ہندی میں خط لکھیں۔ میں بھی ہندی میں جواب لکھ دوں گا (غلط سلط ہندی میں سہی) اُن سے باتیں تو ہو جائیں گی۔

چشم بہ راہ ہوں جوابِ باثواب کے لیے۔

رشید حسن خاں

یہ میں پچھلے کسی خط میں لکھ چکا ہوں کہ خلیق انجم صاحب ’امراؤ جان‘ کے اُس نسخے کو حاصل نہیں کر سکے۔ کہہ دیا گیا کہ میرے پاس نہیں۔ اُسے بھی اب تلاش کرنا ہے۔ اِن مثنویوں کے بعد اُسی کی باری ہے اور اِس کام کو بھی اب کر ہی لینا ہے۔

31 مئی 1995

نیّر صاحب!

آج ہی بھری دوپہر میں آپ کا خط ملا، فی الفور جواب لکھ رہا ہوں۔ خدا کرے اسی قدر جلد یہ وہاں پہنچے بھی۔

(1) 'فریبِ عشق' کا 1272ھ کا نسخہ، مطبوعہ مطبعِ آغا جان آپ مجھے بھیج چکے ہیں۔ کرم خوردہ ہے، یہ ضرور ہے، مگر میرا کام چل جائے گا اِس سے۔

(2) 'بہارِ عشق' کا قدیم ترین اڈیشن سلطان المطابع لکھنؤ کا ہے۔ سالِ طبع: 1266ھ۔ اس کے آخر میں نثرِ مصنف بھی ہے۔ یہ بنیادی نسخہ ہے اور اس کی اشد ضرورت ہے۔ متن اِسی پر مبنی ہوگا۔

(3) 'بہارِ عشق'، مطبع محمدی کان پور، سالِ طبع 1268ھ۔ اس کے آخر میں 'ترغیبِ عشقِ حقیقی' کے عنوان سے 23 اشعار کا اضافہ مصنف نے کیا ہے۔ یہ دوسرا اہم نسخہ ہے۔ اِس کی بھی سخت ضرورت ہے۔

(4) گلزارِ اودھ لکھنؤ کا مطبوعہ نسخۂ بہارِ عشق' (1283ھ) آپ بھیج چکے ہیں اور میرے سامنے ہے۔

آپ کو جو نسخے دست یاب ہوئے ہیں، اُن میں سے دو نسخے میرے کام کے ہیں، انھیں بھیجیے:

(1) 'بہارِ عشق'، مطبوعۂ سلطان المطابع 1266ھ۔ 'بہارِ عشق'، محمدی کان پور 1268ھ۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے نظامی پریس والا نسخۂ 'زہرِ عشق' بھیج دیا ہے۔ اُس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ 'زہرِ عشق'، مرتبہ عشرت رحمانی کی مطلق ضرورت نہیں۔ لہٰذا اِن دونوں نسخوں کی تلاش اب غیر ضروری ہے۔ نسخۂ مجنوں گورکھپوری مجھے اب تک نہیں ملا۔ اسلم پرویز صاحب بمبئی گئے ہوئے ہیں؛ مگر گیان چند جین صاحب نے وہ نسخہ بھیج دیا اور 'حیاتِ شوق'، عقیل رضوی صاحب نے بھیج دی۔

آپ اب 'بہارِ عشق' کے یہ دونوں نسخے بھیجیے۔ چشم بہ راہ ہوں۔

آپ نے جو زحمت گوارا کی، اِس کے لیے ممنون ہوں اور شکر گزار۔

رشید حسن خاں

....

17 جون 1995

نیّر صاحب!

پیکٹ مل گیا، جی خوش ہوا اور آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی۔ 1266ھ کا نسخۂ سلطان المطابع بنیادی نسخہ ہے کہ یہی اشاعتِ اول ہے۔

وہ جو ناقص نسخہ ہے افضل المطابع محمدی کا، وہی مطلوب نسخہ ہے، بس ناقص الآخر ہے، خیر اس کا بھی کچھ انتظام ہو رہے گا۔ سنا ہے کہ پٹنے میں ہے۔ لکھا ہے، شاید عکس آ جائے گا۔ مگر ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوسکی ہے۔ اب بس دس دن کے بعد کام شروع ہو جائے گا۔

صائمہ کا خط مل گیا۔ جواب ان کو ذرا اطمینان سے لکھوں گا، یوں لکھنے میں دیر لگے گی۔

اب میں جولائی 1919 کے اُس سرکاری آرڈر کو نکلوانے کی فکر میں ہوں جس کے لیے یہ مشہور کیا گیا ہے کہ وہ ممنوع الاشاعت قرار دیے جانے والے آرڈر کی تنسیخ ہے۔ مجھے یہ سب گپ معلوم ہوتی ہے، لیکن خیر، تحقیق ضروری ہے۔ الہٰ آباد آرکائوز میں وہ کاغذ ہوں گے، اگر ہوں گے۔ فاروقی صاحب کو لکھا ہے، جواب آ جائے تو پھر آگے کی کارروائی ہو۔ ذرا میری کارکردگی کی داد تو دیجیے۔ لکھنؤ ضرور آؤں گا، وہاں نہیں آؤں گا تو کہاں جاؤں گا، ذرا موسم سنبھل جائے۔ تب تک شاید 'گلزارِ نسیم' بھی آ جائے۔

رشید حسن خاں

....

24 جون 1995

میرے بھائی! یہ آپ نے مجھے کس آفت میں ڈال دیا ہے۔ اب ایک نئی کہانی۔ یہ تو شہرت تھی کہ 'زہرِ عشق' کے چھپنے پر حکومت نے پابندی لگا دی تھی، مگر محض شہرت، سند ثبوت کچھ نہیں۔ کسی نے اس کی تصدیق بھی نہیں کی۔

فاروقی صاحب نے 'زہرِ عشق' کا نظامی پریس والا اڈیشن بھیجا تو اُس کے مقدمے میں نظامی مرحوم نے لکھا ہے کہ ''اس کی ممانعتِ طبع کے مسئلے کو حل کرنے

''گورنمنٹ آرڈرز 4-/3559/931 مورخہ 22 جولائی 1919 جوڈیشنل (کریمنل) ڈپارٹمنٹ''
یہ پہلا حوالہ تھا جو سامنے آیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ کاغذات الٰہ آباد کے آرکائوز میں ہوں گے۔ فاروقی صاحب کو لکھا۔ آج ہی اُن کا خط آیا ہے کہ انھوں نے معلومات حاصل کی کہ 1857 تک کہ کاغذات الٰہ آباد میں ہیں اور بعد کے کاغذ لکھنؤ میں ہیں۔ یہ بھی لکھا کہ لکھنؤ آرکائوز کی ڈائرکٹر یا (ڈائرکٹرہ) محترمہ ریتا مشرا ہیں اور یہ کہ وہاں سے کاغذوں کی نقل بہ آسانی مل جاتی ہے۔ یہ بھی لکھا کہ میں ''نیّر صاحب کو لکھ رہا ہوں کہ کسی کی ڈیوٹی لگا ئیں''۔ میں نے آج ہی اسلم محمود صاحب کو بھی خط لکھا ہے۔ اس مسئلے کو بہ ہر حال حل کرنا ہے۔ تو برادر! کچھ کیجیے۔ یہ مصیبت کھڑی کی ہوئی تو آپ ہی کی بات ہے۔ نہ کتابیں فراہم کرتے اور نہ میں اِس پھیر میں پڑتا۔ اب پڑ گیا ہوں تو بھرنا بھگتنا ہے۔ ادھورا کام کیا کروں۔
صبح صائمہ کو خط لکھا تھا ہندی میں، وہ حوالۂ ڈاک کر کے آیا ہوں کہ فاروقی صاحب کا خط ملا۔ اور ہاں، وہ احمد اشفاق صاحب کی طالبہ نے کیا جواب دیا؟ وہ بھی ایک مشکل رہ گئی ہے۔ آپ نے بلایا ہے، میں ضرور آؤں گا، مگر پہلے محسن خاں سے تاریخ کا تعین کر لیجیے تا کہ 'میرے دونوں میٹھے' کہہ سکوں۔ تاریخ سے مطلب زمانے سے ہے کہ صحیح وقت کب ہوگا اور وہ کب ہوں گے اور کب میرے لیے انتظام کر سکے گی۔ باقی تفصیل اُن کو خوب معلوم ہے۔ اِس خط کے جواب کے لیے آنکھیں بچھائے بیٹھا رہوں گا۔

رشید حسن خاں

....

30 جون 1995

برادرم!

میرا خط مل گیا ہوگا جس میں 'زہرِ عشق' سے متعلق سرکاری حکم نامے کی نقل حاصل کرنے کی فرمائش کی گئی ہے۔ چوں کہ اُس کا مجھ سے زیادہ خود آپ کو خیال ہوگا، یوں اس کا مزید حوالہ دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ اب تک اُس کا انتظام کر چکے ہوں گے اور ریتا مشرا صاحبہ سے مراسم بھی گٹھلیوں کے دام کے طور پر سر انجام پا چکے ہوں گے۔

1268ھ کا نسخہ 'بہارِ عشق' ہنوز کہیں سے ہاتھ نہیں آیا نہ سراغ لگا۔ مشکل یہ ہے کہ میرا کام اُس کے بغیر ہو نہیں پائے گا۔ دہ اشعار کی کمی بیشی کا معاملہ اسی نسخے پر منحصر ہے۔ اور کیا کہوں۔

یہ تو ضمنی باتیں تھیں، آج کی اصل بات: میں آج کل 'فریبِ عشق' کے حواشی لکھ رہا ہوں۔ معتقداتی حوالوں سے متعلق میں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہر جگہ آپ کے خط کی عبارت واوین میں لکھ دی ہے مع حوالہ۔ (ایسے دس شعر ہیں)، تا کہ داد ملے تو آپ کو اور بیداد؟ تو آپ پر۔ میں اہلِ دین کے جھگڑوں میں کیوں پڑوں اور پھنسوں، مجھ سے تو یہ قصہ چکایا نہ جائے گا۔ ٹھیک کیا نا؟

اب یہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ آپ کو خط لکھنے سے پہلے اور پہلے ایک بار علی گڑھ سے مرزا خلیل بیگ آئے تھے۔ میں اُن دنوں شاہ عبدالسلام کے مرتبہ 'کلیاتِ شوق' کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کام تو قاعدے سے کیے جانے کا مستحق تھا...... خیر، میں اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا، یہ کیا کہ وہ دس شعر لکھ کر دے دیے کہ ذرا اپنے فاضلِ اجل سے اُن کے متعلقات کو تو لکھوا دیجیے، مجھے ضرورت ہے۔ یہ گویا تمہیدی حصہ تھا، تدوین کے اُس ابتدائی تصور کا۔ خیر، مرزا صاحب کا خط آ گیا اور میں اُسے رکھ کر بھول گیا۔ اب جو کاغذات الٹ پلٹ رہا تھا تو وہ برآمد ہوا۔ آپ کے بعض مندرجات اور اُن کے فرمودات میں اختلاف ہے۔ معلوم صرف یہ کرنا ہے کہ اس سلسلے میں اور کچھ تو نہیں کرنا ہے۔ آپ کی تشریحات علیٰ حالہٖ رہیں گی نا!

(1) آپ نے لکھا ہے کہ ذوالفقار جنگِ احد میں رسولؐ نے حضرتِ علی کو عنایت کی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے: ''یہ تیغ جنگِ خیبر میں رسول اللہؐ نے حضرت علی کو دی تھی۔'' (2) آپ نے لکھا ہے کہ جنگِ خیبر میں جبریل کے تین پَر کٹے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''جنگ خندق میں'' یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ (3) آپ کے مطابق نادِعلی ''جنگِ احد میں نازل ہوئی تھی۔'' اُن کا کہنا ہے: ''جنگ خیبر کے موقعے پر پیغمبرِ اسلام نے فرمایا تھا۔'' نادِعلی کی جو عبارت آپ نے لکھی ہے ،ان کی عبارت اس سے ذرا سی مختلف ہے۔ میں ان کی عبارت لکھتا ہوں: ''نادِعلیاً مظہر العجائب / تجدہ عوناً لک فی النوائب / کلّ ھمٍّ وغمٍّ سینجلی / بعلیٍّ بعلیٍّ بعلیٍّ یعلی۔'' آپ کی عبارت: نادِعلیا مظہر العجائب تجدہ وعناً لک فی النوائب کل ھم وغم سینجلی بنّوتک یا محمد یولایتک یا علی۔''

انھوں نے اسے اشعار کے طور پر لکھا ہے، جب کہ آپ کے یہاں نثری عبارت ہے۔ بھائی! مجھ غریب 'سنّی' پر تبرّا نہ پڑنے پائے، اس لیے ذرا ان فرمودات کو دیکھ لیجیے۔ 'نادِعلی' کی مکمل عبارت پھر سے لکھ دیجیے، مکمل اعراب کے ساتھ۔ یہ بھی لکھیے کہ اب اسے کن مواقع پر پڑھا جاتا ہے۔

نہیں۔ یہ ٹھیک ہے نا!

آپ ان علی گڑھی فاضل کو تو جانتے ہوں گے۔ خدا کسی مردِ معقول کو مذہبی خصوصاً معتقداتی بحثوں میں نہ ڈالے۔ وہی بات کہ (کذا) اپنا مارتا کم ہے، ڈراتا زیادہ ہے۔ صائمہ کو خط مل گیا ہوگا۔ ہندی میں لکھا جاتا تھا کہ آپ پڑھ ہی نہ پائیں۔ اس خط کا جواب فوری طور پر عنایت ہو۔

رشید حسن خاں

....

گائز ہال، 31 جولائی 1995

برادرم!

دونوں خط مل گئے۔ آفاق صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بہت دکھ ہوا، اُن کی قدِّ آدم شخصیت نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ بہت زمانہ ہوا، پہلی بار مولوی اختر علی تلہری مرحوم کے ساتھ میں رضوی صاحب مرحوم سے ملنے کے لیے ادبستان گیا تھا۔ یہ 52، 53ء کی بات ہوگی۔ آفاق صاحب سے اور تلہری صاحب سے بس ایک دو منٹ بات ہوئی ہوگی۔ مجھ سے محض اسلام علیک۔ اس کے بعد رضوی صاحب کا انتقال ہوا تو کچھ دنوں کے بعد لکھنؤ جانا ہوا اور میں آپ کے یہاں تعزیت کے لیے گیا۔ آپ اُن دنوں تھے نہیں، شاید ایران گئے ہوئے تھے۔ خیر، آفاق صاحب اپنے کمرے سے آئے اور انھوں نے بلا تکلف فوری طور پر مجھے پہچان لیا، پھر پہلی ملاقات کا حوالہ بھی دیا اور کچھ دیر گفتگو ہوئی، مجھے بہت تعجب ہوا تھا اُس وقت ان کی حیرت انگیز یادداشت پر۔ خدائے پاک مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اس کو کہتے ہیں کہ ماضی کو حال سے ملانے والی آخری کڑی بھی ٹوٹ گئی!!

اسلم محمود صاحب کا خط آیا ہے۔ اب اُن کے دوسرے خط کا انتظار ہے جس سے آرکائوز کا احوال معلوم ہو سکے گا۔

کئی دن سے مبتلائے بخار ہوں، شاید کسی کی نظر لگ گئی ہے، کہیں نذر چڑھاؤں گا شاید تبھی اچھا ہو پاؤں گا۔ جولائی کے اواخر میں آنے کا وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایماندارانہ کوشش ضرور کروں گا۔

رشید حسن خاں

....

22 جولائی 1995

برادرم!

اسلم محمود صاحب کا خط آیا، کامیابی نہیں ہو سکی۔ مجبوری ہے۔ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔

ہاں برادر! وہ 1268ھ کا نسخۂ 'بہارِ عشق' نہیں ملا۔ کچھ تو جی کیجیے۔ شرنہ اُس کے بغیر ہی کام چلانا پڑے گا۔ ایسا نہ ہو تو خوب؟

'بہارِ عشق' میں ایک شعر ہے:

قبضۂ مرتضٰی علی کی قسم
اُسی اللہ کے ولی کی قسم

ایک صاحب نے بتایا کہ پہلے کبھی یہ قسم بھی کھائی جاتی تھی اور 'قبضۂ' سے مراد قبضۂ ذوالفقار ہے۔ کیا ایسی کوئی قسم تھی؟ 'قبضۂ' کے ایک معنی 'بازو' بھی لکھے گئے ہیں۔

اسلم محمود صاحب نے ایک کتاب کے چند اوراق کا عکس بھیجا، جن میں ذوالفقار کا بیان ہے۔

حالؔی کے شعر کا مطلب سمجھ میں آ گیا:

جھگڑوں میں اہلِ دین کے حالؔی پڑیں نہ آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

سو میں بھی اِس جھگڑے میں نہیں پڑا۔

موسمی حالات کے اثر سے دس دن سے طبیعت ناساز ہے، وہی بخار اور اُس کے متعلقات۔

رشید حسن خاں

25جولائی1995

برادرم!

کل ایک خط حوالۂ ڈاک کیا تھا صبح کے وقت، جس میں یہ شکوہ بھی درج تھا کہ 'بہارِ عشق' کا 1268ھ کا اڈیشن نہیں ملا اور شاید ملے گا بھی نہیں۔

شام کو چار بجے ایک قاصدِ فرخندہ سیر، خوش خبر، ایک پیکٹ لایا، جس میں 'فریبِ عشق'، 'بہارِ عشق' اور 'زہرِ عشق' کے چھے مختلف اڈیشن ملفوف تھے بہ شمول 'بہارِ عشق' نسخۂ 1268ھ، بیان نہیں کر سکتا کہ کیسی مسرت ہوئی ہے، بہ قول شاعر:

یوں اچانک ملاقات تجھ سے ہوئی

جیسے رہ گیر کو

بے طلب دعا

راہ میں ایک ان مول موتی ملے

سوچا کہ آپ کو بھی اِس مسرت میں شریک کروں۔ اشاعتِ اول سے راتوں رات جو مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ شاعر نے اشاعتِ اول پر ضابطہ نظرِ ثانی کی ہے اور متعدد اشعار کا اضافہ کیا ہے، آخر کے عشقِ حقیقی والے اشعار کے علاوہ۔ اگر یہ نسخہ نہ ملتا تو میرا کام ادھورا رہتا۔ ایک نسخہ مطبعِ علوی علی بخش خاں کا بھی ہے 1277ھ کا۔ نول کشوری نسخے بھی ہیں 1871 کے (وغیرہ)۔ اب معلوم ہوا کہ آپ کے شاہ صاحب نے بہت گڑ بڑ کی ہے اپنے نسخے میں۔ خوب ہیں یہ لوگ بھی!

'قبضۂ مرتضیٰ علی' کا استفسار اُس خط میں ہے، اس کا جواب کا منتظر ہوں۔ نیّر صاحب! میرا تجربہ یہ ہے کہ 'باغ و بہار'، 'فسانۂ عجائب'، 'گلزارِ نسیم' اور اب یہ مثنویاں، اِن سب کے نتیجے میں کہ لگن سچی ہو اور آدمی پوچھنے میں شرم نہ کرے اچھے طالب علم کی طرح، اور یہ کہ صبر کی توفیق رفیق رہے، تو پھر ہر نسخہ مل جاتا ہے اور ہر کام ہو جاتا ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز ملی نہیں، اِس میں اکثر کم توجہی کا دخل ہوتا ہے یا پھر اس کو طلبِ صادق نہیں ہوتی اور آدمی کام کو جلد تر کرنا بل کہ بھگتانا چاہتا ہے۔ میں نے 'باغ و بہار' کے سلسلے میں ہندی مینول کی تلاش میں مکمل بیس سال تک صبر کیا اور تلاش کرتا رہا۔ آخر مل گیا، 'باغ و بہار' کے متن کو مرتّب نہیں کیا.................اب کے بھی فصل آم کی یوں ہی نکل گئی!!! افسوس، صد افسوس!!! خیر اگلے سال سہی۔

ہماری بٹیا کیسی ہے، بہت سی دعائیں۔ کبھی کبھی بیگم صاحب کی خدمت میں میری طرف سے آداب بھی پیش کر دیا کیجیے۔ آخر کبھی تو وہاں آنا ہی ہے، ناراض ہوں گی تو چائے بھی نہیں ملے گی یا ملے گی تو خالی خولی۔

رشید حسن خاں

....

گائز ہال، 7اگست1995

حضرت سلامت! 27/جولائی کا خط تین دن پہلے ملا تھا۔

بٹیا کے مصنفہ بننے کی خبر پڑھ کر جی خوش ہوا۔ یہ خبر آپ نے تمثال کو بھی سنائی؟ اِس لفافے میں =/20 کا ایک نوٹ رکھ دیا ہے، یہ میری طرف سے بٹیا کو دے دیجیے اور کہیے کہ لکھتی رہیں، انعام بھی ملتا رہے گا۔ یہ بھی کہہ دیجیے کہ میں جب آؤں گا تو دیکھوں گا کہ کیا لکھا ہے۔ بہ ہر طور میرا جی بہت خوش ہوا۔ خدا اس بچی کی عمر اور صلاحیت، دونوں میں برکت دے۔ برسات کا موسم ہے، اِس کے باوجود اِس کا یقین ہے کہ یہ لفافہ راستے میں گم نہیں ہوگا۔

(1) اب داستانِ غم (حسبِ معمول)۔ 'صحنک' کا لفظ ایک جگہ آیا ہے۔ اِس سے تو میں واقف ہوں، لیکن بس یوں ہی سا۔ میں نے یہ سنا تھا کہ مرد اس میں شرکت نہیں کر سکتے، مگر مولفِ 'نور اللغات' نے اِس لفظ کے تحت میر علی اوسط رشکؔ کی عبارت نقل کی ہے، اُس کے آخری حصے نے مجھے مبتلائے وہم کر دیا ہے۔ پہلے عبارت:

''رشکؔ نے نفس اللغتہ میں لکھا ہے: آں طعامے باشد کہ زناں از برنج پزند و چند طبق ساز و بالائے آں جغرات وشکر ریزد۔ خواہ بجائے جغرات شیر اندازند و بالائے آں فندِ سائیدہ ریزند، وبقولات وعطر وحنا بر کنارِ آں نہند و بر آں فاتحۂ جناب سیّدہ النساء دہانند۔ وزمانہ راز ناں و مردانہ را مرداں خورند۔ آنکہ در طبقہائے معین زردہ نہند و نذر رند کور دہانند۔''

خط کشیدہ ٹکڑے توجہ طلب ہیں۔ تو کیا مردانہ صحنک بھی ہوتی ہے؟ رشکؔ بہر حال سیّد تھے اور لکھنوی تھے اور شیعہ بھی تھے۔ ... میں کیا لکھوں؟ (میں

صاحبان نے مجھے بہت پریشان کیا ہے)۔

مزید یہ کہ:(1)ترکیب یہی ہے جو رشک نے لکھی ہے۔میں نے کہیں پڑھا تھا کہ زردہ بھی بعض جگہ ہوتا ہے ۔یعنی صرف زردہ (پلاو والا زردہ)۔(2) کیا 'زنانہ صحنک' میں صرف 'سیدانیاں' شریک ہوسکتی ہیں؟ کیا دوسری عورتیں پاک دامن ہونے کے باوصف شریک نہیں ہوسکتیں؟(3) پاک دامن ہونا شرط ہے یا بن بیاہی ہونا بھی شرط ہے۔آپ کی بیگم صاحبہ نے کبھی صحنک میں شرکت کی ہے(مطلب یہ ہے کہ آپ کے حیطۂ تصرف میں آنے سے پہلے۔اب اُن بے چاری کو اتنی مہلت کہاں ملتی ہوگی)انھوں نے کیا دیکھا ہے، نیاز کا کھانا اور شرکا کے سلسلے میں۔(رشکؔ کا لغت نفس اللغتہ چھپا تو 'ت' تک، مگر اِس کا ثبوت موجود ہے کہ یہ مکمل ہو چکا تھا۔مولفِ 'نور' نے جو عبارت نقل کی ہے، یہ شہادتِ مزید کی حیثیت رکھتی ہے)۔

(2)نوج اِس طَرح بھی کوئی گھبرائے
نج کوئی اِتنی ہَول جَول مچائے

میرا خیال یہ ہے کہ 'نج' اِسی 'نوج' کی مخفف شکل ہے۔ذرا بیگمات سے پوچھیے تو کہ کبھی یہ لفظ کانوں میں پڑا ہے؟ آپ کی خوش دامن صاحبہ شاید بہتر طور پر بتاسکیں۔'نور' میں یہ موجود نہیں۔

محمود ایاز صاحب کا خط آج ملا۔ان کو مناسب جواب کل یا پرسوں لکھوں گا۔فی الحال تو کچھ لکھنا ممکن نہیں۔مرزا شوقؔ مبتلاے آفت کیے ہوئے ہیں۔یکم ستمبر سے 30/ستمبر تک میں جموں میں رہوں گا۔ویسے بھی بعادر! جس رسالے کی میں نے کبھی شکل نہیں دیکھی۔اُس کے لیے کیا لکھوں؟ وہ نارنگ صاحب کے فدائیوں میں سے ہیں، اِس لیے مجھ جیسے لوگ تو حلقۂ بیرونِ در کی حیثیت رکھتے ہوں گے۔خیر، جموں سے واپس آ کر دیکھا جائے گا۔

اکتوبر میں شاہ جہاں پور جاؤں گا، تبھی چند گھنٹوں کے لیے لکھنؤ آؤں گا۔حافظؔ کے تصوف پر اور اُن کے دیوان سے فال نکالنے کے مسئلے پر گفتگو ہوگی۔(یہ بھی ایک مصیبت کی تمہید ہے)۔خدا کرے آپ، جس حد تک اِس زمانے میں ممکن ہے، اُس حد تک عافیت ہوں۔

رشید حسن خاں

....

22اگست 1995

سیّد صاحب! 12/ کا خط ملا۔شکریہ۔صحنک کا بیان آپ کے حوالے سے ضمیمۂ تشریحات میں درج کر لیا گیا۔

اب یہ عرض کروں کہ تینوں مثنویات کا متن مکمل ہو گیا بہ لحاظِ تدوین۔فرہنگ بن گئی، ضمیمۂ تلفظ واملا اور ضمیمۂ تشریحات بھی مکمل ہو گئے۔متن کتابت کے لیے دے دیا گیا۔آپ سمجھے کہ یہ غیر ضروری تفصیل میں نے کیوں لکھی ہے کہ آپ کو اطمینان ہوجائے کہ اب بار بار مخلِ عافیت ہونے کی نوبت (اِس سلسلے میں) نہیں آئے گی۔بس یہ خط اور۔

'بہارِ عشق' کے آغاز میں شوقؔ نے لکھا ہے:

اپنے قابو میں جو طبیعت تھی
کوچہ گردی سے دل کو نفرت تھی
خَفَقاں گر کبھی ستاتا تھا
تو ہَوا کھانے چوک جاتا تھا

ضمیمۂ تشریحات میں 'چوک' کے تحت شررؔ کی یہ عبارت نقل کی گئی ہے:

''محمد علی شاہ نے.....لکھنؤ کو نہایت ہی خوب صورت شہر بنا دیا۔حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کے کنارے کنارے ایک سڑک نکالی ،جو 'چوک' کہلاتی تھی۔اس سڑک پر.....''

(میں نے مکمل عبارت نقل کی ہے، یہاں محض اشارے پر اکتفا کرتا ہوں)۔آج کل جب لفظ 'چوک' استعمال کیا جاتا ہے تو اُس سے تو وہ خاص علاقہ مراد لیا جاتا ہے، مگر میرے خیال میں شوقؔ نے 'چوک' سے وہی علاقہ مراد لیا ہے جس کی صراحت شررؔ نے کی ہے۔کیا آپ کو اِس سے اتفاق ہے؟ اب یہاں بیٹھا ہوا میں لکھنؤ کے جغرافیے سے ناواقفِ محض، یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ شررؔ نے جس علاقے کی نشان دہی کی ہے چوک کے نام سے، وہ اِس 'چوک' سے مختلف ہے نا؟ یہ دونوں الگ الگ علاقے ہیں نا؟

مصرعے میں خاصی تعقید پیدا ہو جاتی ہے اور 'اپنے' سے یہ صورت پیدا نہیں ہوتی۔ مفہوم دونوں صورتوں میں یکساں رہتا ہے۔ ضمیمۂ تشریحات میں یہی صراحت کی گئی ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

ہاں صاحب! میں یکم ستمبر سے 30 ستمبر تک جموں یونی ورسٹی میں رہوں گا۔ وہاں بوڑھے توتوں کو پڑھانا ہے۔ خط کا جواب آپ فوری طور پر لکھ دیجیے۔ مجھے مل جائے گا یا پھر یہاں محفوظ رہے گا۔ جب واپسی ہو گی تو ڈاک سے بہ حفاظت مل جائے گا۔

اور یہ آپ گھبرا کیوں گئے! ایسی بھی کیا بات ہے۔ امیر خسرو اور خواجہ حافظ اعلا درجے کے شاعر تھے۔ خوش ذوق انسان تھے مگر پیری فقیری یا تصوف سے انھیں کیا واسطہ! ان کو صوفی کہنا انتہا درجے کی بد ذوقی ہو گی۔ کیا منٹو کے بہ قول یہ ضروری ہے کہ ایسے سب لوگوں کو رحمتہ اللہ علیہ کی کھونٹی پر ٹانگ دیا جائے۔ میں بہ ہر طور اسے نہیں مانتا۔ جب نہیں مانتا تو کہوں گا بھی اعلانیہ اور سرِ محفل۔ احمقانِ قوم چیں بر جبیں ہوں تو ہوا کریں، اُن کی تو قسمت ہی یہی ہے۔ اب رہی فال کی بات، تو یہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اِس کا کسی غیبی لطیفے سے بالکل علاقہ نہیں۔ مجھے اب کے یہی تو کہنا ہے کہ اشعار سے فال جو نکلتی ہے، اُس کی حقیقت کیا ہوتی ہے۔ یہ قطعی طور پر ایک ادبی مسئلہ ہے، جس کا تعلق غزل کی شعریات سے ہے۔ اس کی تفصیل پیش کروں گا اور تجزیہ کروں گا۔ میں اکتوبر میں شاہ جہاں پور آؤں گا اور تبھی چند گھنٹوں کے لیے لکھنؤ کا پھیرا ہو گا، تب اِس مسئلے پر مفصل گفتگو ہو گی۔

رشید حسن خاں

....

گائر ہال، 8 اکتوبر 1995

برادرم!

خط ملا۔ اپنی بدحواسی کی داد دیتا ہوں کہ تسیم کو رشک کا استاد بھائی تحریر فرمایا۔ یہ تو واقعی خوب رہی! کون مانے گا اس کو کہ مقدمۂ کلامِ ناسخ اِسی قلم نے لکھا تھا۔ بشریت شاید اسی کو کہتے ہیں۔ آپ کا ممنون ہوں کہ یہ فاش غلطی سامنے آ گئی۔ اگر کوئی اور بھی ایسی بات ہو تو ضرور مطلع کیجیے گا۔ نظرِ ثانی کے وقت کام آئے گی۔ 'فسانۂ عجائب' کا دوسرا اڈیشن جلد چھپے گا۔ پہلا اڈیشن ختم ہو گیا۔ ناشر کو بھی اس کی توقع نہیں تھی۔ بہر حال یہ خوب ہوا۔

ہاں یہ بتائیے کہ حواشی میں کیا زائد اجزا بھی ہیں؟ آپ کے خط میں جو یہ لکھا ہے کہ اربابِ نقد کو دیکھیے 85 صفحوں پر 627 صفحے ہضم ہوتے ہیں کہ نہیں۔ اس سے یہ وہم پیدا ہوا کہ تشریحات کے صفحے تو کل 300 ہیں۔ میں نے ایک بار پھر ورق گردانی کی، مگر مجھے اب بھی کوئی زائد حصہ نظر نہیں آیا۔ یا یہ جملہ محض دوسروں کی نذر تھی۔

'مثنویاتِ شوق' کا کام رُک گیا ہے۔ شاہ جہاں پور ہی میں مکمل ہو سکے گا۔ متن کی کتابت بہ ہر حال ہو چکی ہے۔ مقدمہ لکھنا باقی ہے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں، میں اواخر جنوری میں شاہ جہاں پور مستقلاً منتقل ہو جاؤں گا۔

اگر آپ کی نظر میں کوئی شخص واقعتاً 'مستحق' ہو محض مروّتاً نہیں تو لکھیے، میرے پاس ایک جلد بچ گئی ہے، اُسے بھیج دوں۔ جنوری کی شروع کی تاریخوں میں بمبئی میں حافظ سمینار ہے، اس میں شرکت کرنے کا ارادہ ہے۔ 9 جنوری کو وہاں سے واپسی ہو گی، اُس کے بعد شاہ جہاں پور جانے کا اہتمام شروع ہو جائے گا۔ غالب سمینار میں آپ سے ملاقات ہو گی۔ 'امراؤ جان' کے لیے کچھ لوگوں سے کہیے۔ تعجب ہے کہ لکھنؤ میں وہ اڈیشن نہیں مل سکتا۔ حیدر آباد میں شاید ہو، کچھ کیجیے۔ 'سوغات' والی بات ٹھیک ہے، شاید اسی طرح کچھ سراغ ملے۔ محمود ایاز صاحب کے اصرار پر میں نے خط کے اُن اجزا کو شاملِ رسالہ کرنے کی اجازت دے دی ہے جن کو وہ مناسب سمجھیں۔ اصل میں ادھر کچھ دنوں سے 'شاعر' اور 'شب خون' میں جس طرح کے تعریفی خط چھپ رہے ہیں اُس سے طبیعت بہت منغّض ہوتی ہے، یوں میں نے اس خط کو شاملِ اشاعت کرنے سے منع کیا تھا۔ مرگِ انبوہ میں بل کہ ہیضے کی بیماری میں کون مرے! صائمہ کو بہت سی دعائیں امتحان میں اچھی کامیابی کے لیے۔ نئے سال کے کارڈ کا انتظار کروں گا۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 25 فروری 1996

نیّر صاحب! باسی عید مبارک۔

آپ بھی خوب چیز ہیں، مجھے 'زہرِ عشق' میں الجھا کر خود اطمینان سے روزے رکھتے رہے اور ثواب حاصل کرتے رہے۔ اب کئی قسطوں میں اس کا کفارہ ادا

’بہارِ عشق‘ کی اشاعتِ اول (سلطان المطابع 1266ھ) میں یہ مرقوم ہے کہ یہ مثنوی شوقؔ نے بہ فرمایش نواب ابوتراب خان صاحب بہادر دام اقبالہٗ لکھی تھی۔ یہ غالباً وہی ہیں جن کے نام کا ’’کٹرا ابوتراب خاں‘‘ اب تک موجود ہے (اگر یہ نام میں نے صحیح لکھا ہے)۔ ان سے متعلق چار پانچ سطروں کا حاشیہ لکھنا ہے، زحمت گوارا کیجیے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کا احوال کہاں ملے گا۔ متن کی کتابت مکمل ہو چکی، حواشی لکھے جا چکے جو زیرِ کتابت ہیں۔ بس مقدمہ لکھنا باقی تھا، سو آج کل اسی میں الجھا ہوا ہوں۔ یہاں کا احوال یہ ہے کہ معمولی کتابیں ہاتھ نہیں آتیں۔ سر راس مسعود کے ’’انتخاب زرّیں‘‘ کی بس دومنٹ کے لیے ضرورت تھی، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی پہلی اشاعت کا سنہ کیا ہے اور یہ کہ ’زہرِ عشق‘ کے بارے میں انھوں نے کیا لکھا ہے، اس عبارت کی ضرورت تھی۔ یہ کتاب نہیں مل رہی ہے۔ آپ کے پاس ہے؟ ضرور ہوگی، تو برادر! اس سے بھی یہ دونوں چیزیں نقل کر دیجیے۔ اللہ آپ کو اس کے بدلے میں بہت سی حوریں دے گا (اگر آپ کی بیگم صاحبہ کو اعتراض نہ ہوا اور وہ ’عدل‘ کی طالب نہ ہوئیں)۔

اگر جواب باصواب جلد تر مل سکے تو بہت ممنون ہوگا۔

رشید حسن خاں

....

بمبئی، یکم اکتوبر 1996

محبّ مکرم!

معلوم نہیں اب آپ کی صحت کا احوال کیا ہے، لیکن آپ کی صحت و عافیت کے لیے دعائیں کرنے والے اتنے ہیں کہ یہ مانے لیتا ہوں کہ اب آپ پوری طرح صحت مند ہو چکے ہوں گے۔

میں آج کل مولانا شبلی کی یاد میں یہاں دن بسر کر رہا ہوں۔ راتیں گزارنے کی توفیق نہیں۔ راتیں بس کٹ جاتی ہیں۔ میں 3/نومبر کو شاہ جہاں پور پہنچوں گا۔ اس وقت میرا جی چاہا کہ میں خیریت پوچھنے کے بہانے یونی ورسٹی لائبریری کے خطی نسخہ ہائے ’سحر البیان‘ کی یاد دلاؤں۔ بھائی! میں اس معاملے میں یکسر بے دست و پا ہوں، آپ ہی کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر یہ کام ہو سکے تو میرا کام چلے۔ کوئی صورت نکالیے۔ چوں کہ یہ کام انجمن کا ہے، اس لیے اس سلسلے کا سارا خرچ وہاں سے ملے گا۔ کیا کوئی صورت نکلی ہے؟

یہ خط آپ کو زیادہ سے زیادہ چار دن میں مل جائے گا اور آپ کا خط مجھے نویں دن مل سکتا ہے۔ میں ابھی سے اس کی راہ دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ کیا بھائی کاظم علی خاں کام نہیں آسکتے، مدد تو وہ کرتے رہتے ہیں سب کی۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ چشم براہ

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 6 مئی 1997

نیر صاحب آداب

جوابی پوسٹ کارڈ ملا شکریہ۔ معلوم ہوا کہ پرسانِ حال موجود ہیں، اسی لیے ابھی یہ دنیا رہنے کی جگہ ہے۔ ایسی ہی باتوں سے زندہ رہنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ کے پاس جو خبریں پہنچی ہیں، وہ کس واسطے سے آئی ہیں، اس کا حال مجھے معلوم نہیں؛ اس لیے ان پر تبصرہ نہیں کر سکتا۔ شاید آپ کا کشف ہو، ساٹھ سال کے بعد بہت سے لوگ اس دولت سے سرفراز ہو جایا کرتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ مجھ سے ایک صاحب نے یہ روایت بیان کی کہ نیّر صاحب حج کرنے گئے تھے، آپ کو معلوم نہیں۔ مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ بھائی! یہ خبر کچھ جمی نہیں۔ وہ تو نو کی تعداد بھی پوری کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، 900 کی تعداد کیسے پوری ہوئی ہوگی۔ اور بالفرض دنیائے دوں سے ایسی ہی بیزاری ہوگئی تھی تو کربلائے معلا جاتے۔ ان صاحب نے کہا کہ وہاں تو مردِ نا معقول صدام حسین بیٹھا ہوا ہے، کیسے جاتے۔ میں نے جواباً کہا کہ حضرت حسینؓ کربلا گئے تھے افواجِ یزید کی موجودگی میں، صدام حسین کے ہوتے ہوئے نیر صاحب کیوں نہیں وہاں جا سکتے۔ صحیح بات کیا ہے، یہ آپ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

طبیعت میری کیسی ہے، فی الوقت اس کا ٹھیک ٹھیک حال مجھے بھی نہیں معلوم۔ 26 اکتوبر کو بلڈ ٹسٹ ہوگا، اس کی رپورٹ بمبئی بھیجوں گا۔ وہاں سے جواب آنے پر طبیعت کا حال معلوم ہوگا۔ بہ ظاہر کھاتا پیتا ہوں۔ ہاں کسی کو دیکھ کر درود شریف نہیں پڑھ سکتا، یوں کہ یہاں اس کے مواقع ہی نہیں۔ جولائی، اگست دو ماہ بمبئی میں رہا اور ڈاکٹر سے برابر رجوع کرتا رہا اور دوائیں کھاتا رہا۔ دوائیں اب بھی کھا رہا ہوں۔ دسمبر کے اواخر میں پھر بمبئی جاؤں گا اور شاید دو ماہ

سے اس کا آغاز کرسکوں۔ ارادہ تو یہی ہے۔

اس کا قوی امکان ہے کہ اواخر نومبر میں چند گھنٹوں کے لیے لکھنؤ آؤں۔ میرے کرم فرما ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کے بھائی اشتیاق محمد خاں کا بمبئی میں انتقال ہو گیا، ان کی تعزیت کرنا ہے۔ جینؔ صاحب سے مستقلاً امریکہ جائیں گے دسمبر میں، ان سے رخصتی ملاقات کرنا ہے۔

عرشی زادہ کا ایسا اچانک انتقال ہوا ہے کہ جی دہل کر رہ گیا۔ موت کا جھونکا پڑھا تھا، اس کا عمل اب معلوم ہوا۔ سچ ہے، یہ دنیا فانی ہے، مگر تدوین کا کام کرنے والوں کے لیے یہ سوچنا بھی گناہ ہے، اس لیے میں بھی نہیں سوچتا۔ ہاں، اپنے آپ خیال آ جائے، وہ اور بات ہے۔

صائمہ کو بہت سی دعائیں اور ثمرہ کو بھی! دونوں نے دنوں سے خبر نہیں لی۔ میں بھی خط نہیں لکھ سکا اس آنے جانے کی رواداری میں اور ہنگاموں میں۔ انھوں نے معمول کے خلاف اب کے نئے سال کا کارڈ بھی نہیں بھیجا۔ صبؔا اکبرآبادی کا یہ شعر کل پڑھا، حسن تعبیر سے دل پر نقش ہو گیا:

بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے
آدمی آدمی اکیلا ہے

اور ظفؔر گورکھپوری کا یہ شعر بھی:

میلے کی بھیڑ راس نہ آئی فقیر کو
جھولی میں چند خواب تھے جانے کہاں گرے

آپ کیسے ہیں۔ بیگم صاحبہ سے میرا اسلام کہیے۔

رشید حسن خاں

'عشق نامہ' ملا۔ عرفان (صدیقی) صاحب کا پتا میرے پاس نہیں، رسید نہیں بھیج سکا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو ایک سطری خط لکھ بھیجیے، ممنون ہوں گا۔

....

شاہ جہاں پور، 24 نومبر 1997

نیر صاحب مکرم!

19 کو میں لکھنؤ میں تھا۔ بہانہ تھا ریڈیو، مگر درحقیقت ڈاکٹر اشفاق محمد خاں کے یہاں تعزیت کے لیے جانا تھا۔ ان کے بھائی اشتیاق محمد خاں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اشفاق صاحب سے دہلی کی ملاقات ہے اور بڑے مخلص اور بے ریا شخص ہیں۔ بہت سی شامیں ہم لوگوں نے ساتھ گزاری ہیں۔ وہ اِندرا نگر میں رہتے ہیں یعنی دوسرے لکھنؤ میں۔ وہاں محسن زیدی سے ملاقات ہو گئی کہ میرے پُرانے ملاقاتی ہیں اور وہیں گیان چند جینؔ کے یہاں ذرا سی دیر کے لیے گیا کہ وہ امریکہ مستقلاً منتقل ہونے والے ہیں۔ زیدی صاحب کے یہاں سے آپ کو فون کیا۔ عزیزم تمثال (1) نے بتایا کہ آپ محوِ استراحت ہیں۔ شام کو واپسی لازم تھی۔ یوں اس بار آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ اس کی معذرت۔ یہ بڑی کمی رہی۔ اب کسی دن محض آپ سے ملنے کے لیے وہاں آؤں گا۔ صائمہ اور ثمرہ کے خط مل گئے، ان کو چند روز بعد الگ سے خط لکھوں گا۔

رشید حسن خاں

(1) تمثال مسعود، میرا بڑا بیٹا (نیر مسعود)

....

شاہ جہاں پور، 29 نومبر 1997

نیر صاحب!

میرا خط ملا ہوگا، جس میں معذرت طلبی کا ذکر تھا۔

اس وقت یہ خط استفسارات کے پُرانے سلسلے میں لکھ رہا ہوں اور فوری طور پر جواب کا متمنی ہوں، اگرچہ موسم آج کل بہت صبر آزما ہے:

(1) گر آواز سن صید کی کچھ کہے
تو باز آئے چپّک کہ بہری رہے

یہ آصف الدولہ کے عدل کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ کیا کہا گیا ہے، یہ آپ ہی کو معلوم ہوگا۔ میں تو سمجھ نہیں پایا۔ کیا یہ مطلب ہے کہ اس کے عدل کی ہیبت

(2)شکار کے شوق کے بیان میں:

شجاعت کا یہ ہمت کا کام ہے
درم ہاتھ میں ہے کہ یا دام ہے/کہ بادام ہے

میں کچھ نہیں سمجھا۔سخاوت کا بیان ہوتا تو کہتا کہ درم اور بادام کا تقابل ہے۔دو نسخے ہیں: بادام ہے۔کہ یادام ہے (مختلف نسخوں میں)۔

(3)چرندوں کا دل اس طرف ہے لگا
پرندوں کو رہتی ہے اس کی ہوا
پلنگوں کا ہے بل کہ چیتا یہی
کمر آ بندھادے ہماری وہی

اللہ جانے بڑے میاں کیا کہہ گئے! چیتا اور پلنگ کی مناسبت ظاہر ہے، یہاں تجنیس خطی ہے چی تا اور چے تا۔سارا جھگڑا چوتھے مصرعے کا ہے۔چیتے کی ایک جیسی کمر شاعروں نے کہا ہے، مگر یہاں کمر بندھانے کا محل کیا ہے۔کیا یہ مطلب ہے کہ ممدوح کمر بندھاوے تب چیتے شکار کے قابل ہوں۔

اب اصل شعر:لکھنؤ کی قحط سالی کا ذکر کرتے ہوئے اور آصف الدولہ کی رعیت پروری کے گن گاتے ہوئے لکھا ہے کہ جب یہ مصیبت خلق پر پڑی تو:

محلے محلے کیا حکم یہ
کہ ہاڑے کی اس غم کے کھولیں گرہ

گرہ کے لحاظ سے پہلے میں سمجھا کہ یہاں 'ناڑے' ہوگا۔پھر خیال آیا کہ محلے کی مناسبت سے 'باڑے' آنا چاہیے۔خیال آیا کہ آپ سے پوچھوں کہ کیا کوئی مقامی رسم یا طریق ہے باڑے کی یا ہاڑے سے گرہ کھولنا۔

اب آپ کا جواب آجائے تو کچھ ذہن کو روشنی ملے۔انشا نے شاید ایسے ہی شعروں پر جل کر کہا تھا کہ مثنوی لکھی ہے یا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔(انشا کی مراد دوسری تھی)

چشم براہ ہوں۔دونوں بیٹیاؤں کو دعائیں۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 16 دسمبر 1997

(بلا القاب) 11/دسمبر کا خط پرسوں ملا یعنی تیسرے دن ہی مل گیا۔یہ محکمۂ ڈاک کی مہربانی ہے۔بھائی! آپ نے میر حسن کی طرف داری کا حق ادا کر دیا۔ایسی تاویلیں کی ہیں کہ اب کوئی مولوی بھی آپ سے بحث نہیں کر سکتا۔مگر خوب ذہن لڑایا ہے۔میں نے استفادہ کیا (یا آپ کہیں تو استفادہ حاصل 1 کیا)۔کتر بیونت کے ساتھ انھیں درج تشریحات کر لیا۔آپ کا حوالہ آخر میں آئے گا۔

میں 17 دسمبر کو یعنی کل جودھ پور جاؤں گا، جی ہاں اسی صبر آزما موسم میں۔وہاں سے دہلی آؤں گا غالب سمینار میں شرکت کروں گا۔آپ 'سحر البیان' کے نسخے وہیں لیتے آئیے گا۔میں آپ سے لے لوں گا اور 'مثنویاتِ شوق' والے نسخے واپس کر دوں گا۔یعنی اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے۔اور مرزا صاحب کا مطلب بھی کچھ ایسا ہی ہے: سلطنت دست بہ دست آئی ہے۔ایک نسخے میں ہے: آئی ہے، اور یہاں وہی مرجح ہے۔اب تک صرف 632 اشعار مع تشریحات واختلافِ نسخ اور معِ ضمیمۂ تلفظ و املا مکمل ہو سکے ہیں۔بجلی کے غائب رہنے نے بیزار کر دیا ہے۔جو کام کا وقت ہے وہی اس کے جانے کا ہنگام ہے۔رات بھر رہتی ہے، مگر میں نے رات میں کبھی لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا۔دن کا کام دن میں اور رات والا کام رات میں۔اب رات والے کام تو صحیفۂ منسوخ کی آیات کے مرادف ہیں، مگر عادت کے زیرِ اثر کوئی کام نہیں کر پاتا۔صبح پانچ بجے اُٹھ کر ساڑھے پانچ بجے میز پر کام کرنے جہاں بیٹھا اور بجلی گُل۔پھر گیارہ بجے، بارہ بجے آتی ہے۔جی اوب گیا ہے۔اسی لیے اس کام میں اتنی تاخیر ہو رہی ہے۔

ارے ہاں، ایک بات رہ ہی گئی۔بڑے میاں نے لکھا ہے:

طریق کے طرق اور پرے کے پرے
کچھ ایدھر اُدھر، کچھ، ورے کچھ پرے

میں نظر سے گزرا ہے؟ طُرق یا طُرَق، یا طَرَق۔ نسخۂ فورٹ ولیم کالج میں 'طُرق'۔ آپ کے خط کا انتظار ابھی سے کر رہا ہوں۔

رشید حسن خاں

1۔ اُس وقت استفادہ 'حاصل' کرنا کے صحیح یا غلط ہونے کی بحث چل رہی تھی (نیر مسعود)۔

....

شاہ جہاں پور، 30مارچ1998

نیر مسعود صاحب جوابی خط لکھیں! یہ تو صاف قربِ قیامت کے آثار ہیں۔ اس کا قوی امکان ہے کہ میں دفعہ 501 تعزیراتِ ہند میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کروں۔ یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ اس کے بغیر جواب نہیں لکھا جائے گا۔ اب کچھ لمحوں کے لیے ماتم کرنا مجھ پر فرض ہو گیا۔

بھائی! میں ٹھیک ہوں، مگر پریشان خاطر۔ ذہن یک سو نہیں ہو پا رہا ہے۔ صحت ڈانواڈول سی رہتی ہے، کبھی عمدہ، کبھی محسوس ہوتا ہے کہ بُرے آثار ہیں۔ آج کل پچھلے چودہ پندرہ دن سے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا ہے۔ اس کی بھی دوا ہو رہی ہے۔ ارادہ یہ ہے کہ مئی کے پہلے ہفتے یا دوسرے ہفتے میں پھر بمبئی جاؤں۔

مخمور سعیدی سے 36 سال کے مراسم تھے، وہ بدگمان ہو گئے۔ ہوا یہ کہ وہ اب دہلی اُردو اکیڈمی کے سکریٹری ہو گئے ہیں، ان کے زمانے میں دو دن کا پہلا سمینار ہوا، مجھے چار خط لکھے، کیسے جاتا نہیں گیا۔ اب وہ ناراض ہیں۔ ان کی ناراضی بھی برحق اور میرا جانا بھی برحق۔ علی گڑھ بھی نہیں جا سکا، حالاں کہ ابوالکلام قاسمی صاحب کا بہت خیال کرتا ہوں اور ابھی الٰہ آباد سے بلاوا آیا تھا، کیسے جاتا۔ اپنا حال میں ہی جانتا ہوں، احباب کو یقین کیسے دلاؤں۔ خیر، ان فضولات سے قطع نظر، میں ٹھیک ہوں یوں کہ سارا دن میز پر بیٹھ کر کام کرتا ہوں، وہی 'سحر البیان'۔ اس کے بارہ نسخے سامنے ہیں، خطی نسخے، ہر شعر میں دوسرے نسخے میں الفاظ مختلف ہیں۔ میرے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ مثنوی میر حسن ہی نے کہی تھی؟ اور کہی تھی تو انھوں نے کیا لکھا تھا؟ نیر صاحب! یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میر حسن کے اصلی متن کا قطعیت کے ساتھ تعین کیا جا سکے۔ بس قیاس کی بنیاد پر جو کہہ لیا جائے، کہ اس شعر میں انھوں نے یہ لفظ رکھا تھا یا رکھے تھے۔ اس مثنوی میں کل 2198 اشعار کا اختلافِ نسخ اس مثنوی کی مجموعی ضخامت کے برابر ہو چکا ہے۔ اب آپ کیا کہیں گے؟ جتنے کاتب، اتنا ہی متن۔ یہ وہی بات ہوئی کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اور الحاقی اشعار کی بھی کمی نہیں۔ ایک کاتب صاحب نے 1209ھ میں یہ دیکھ کر کہ بیانِ وصل میں تو میر صاحب نے کچھ لکھا ہی نہیں گویا، سترہ اشعار کا اضافہ فرما دیا، جس میں یہ بات بھی ہے کہ ایک سفید رومال بھی سرہانے رکھ دیا گیا تھا (یہ جعلی اشعار اس نسخے کی وساطت سے نسخۂ ندوردہ تک پہنچے، جنھیں میرے کرم فرما حیدری صاحب نے نعمتِ عظما سمجھ کر شاملِ متن رکھا۔ خوب ہیں ہمارے حیدری صاحب بھی)۔

خلیق انجم صاحب کا خط آیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ 'مثنویاتِ شوق' پریس سے ایک ہفتے میں آ جائے گی۔ میرے پاس آئے تو آپ کے پاس پہنچے، اس پر آپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ آپ نے بلایا ہے، وہاں نہیں آؤں گا تو کہاں جاؤں گا؟ مگر ابھی نہیں پہلے یہ 'سحر البیان' مکمل ہو جائے۔ یہ رہ گئی تو پھر رہ ہی جائے گی اور ساری محنت اکارت جائے گی۔ اس کا یقین ہے کہ یہ کام مکمل ضرور ہو گا، اس میں ابھی سال بھر اور لگے گا۔ اپنی سخت جانی پر جو اعتماد ہے مجھے، اس کی بنا پر یہ کہہ رہا ہوں۔

صائمہ کو الگ سے خط لکھوں گا۔ ان کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا ضرور کھاؤں گا۔ اس کام کو مکمل کرتے ہی وہاں آؤں گا۔ صائمہ کو مجھ سے ضرور شکایت ہو گی؛ مگر مطمئن رہیے، بہت آسانی سے انھیں منا لوں گا، وہ بہت اچھی بٹیا ہے۔ اس وقت صبح کے ٹھیک پانچ بجے ہیں، یعنی جب خط لکھنے بیٹھا تھا تب پانچ بجے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے میں اپنا کام کرنے میز پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اب سوئی وہیں پہنچنے والی ہے، اِس لیے اس خط کو ختم کرتا ہوں اور اس کام کو شروع کرتا ہوں۔ کبھی میرے لیے دعا بھی کیا کیجیے، شاید آپ کی دعا میں اثر ہو۔ دیکھا گیا ہے کہ جن کی باتوں میں اثر ہوتا ہے اُن کی دعائیں بھی بے اثر نہیں ہوتیں۔ ہاں صاحب! آپ کا خط پا کر اس بار خاص طور پر جی بہت خوش ہوا اور تاب و تواں میں کچھ اضافہ ہوا۔ اب ایسے مخلص اور غم گسار کہاں ہیں! خدا آپ کو خوش رکھے۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 21اپریل1998

برادرم!

کھلے جس طرح لالۂ نور و باغ
ہوا دل جو روشن چراغان سے
پڑھتے شعر نوری کے دیوان سے
وہ کالے پیادے اور ان کا نفیر
کہ تا چرخ پہنچے صدا دل کو چیر

میں ان تینوں الفاظ سے واقف نہیں ہوں۔'نور باغ' شاید لکھنؤ کا کوئی باغ ہوگا۔'نوریؔ' شاعر کون تھا، معلوم نہیں۔ یہی احوال' کالے پیادے' کا ہے۔ان میں سے کوئی مقام جو حل طلب ہے حل ہوسکتا ہے؟ بتّیو اوتو جروا۔

مجھے آپ وہاں کب بلا رہے ہیں؟ مئی کا تو پورا مہینا محرم کا ہوگا۔ پھر صائمہ کے ہاتھ کا کھانا کیسے ملے گا، اور شاید 19 مئی تک تو ان کا امتحان ہی ہوگا۔ اس فنکشن کو جون میں رکھایئے۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 2 مئی 1998

برادرم!

ابھی آپ کے دو خط ملے۔شکریہ۔

ضروری باتیں: (1)'نوریؔ' نام کے شعرا سے تو واقفیت تھی، مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ صاحب دیوان کون ہے؟ میر حسن نے'نوریؔ' کے دیوان کا ذکر کیا ہے۔اُردو کے دونوں شاعر بس دو ایک شعروں کے مالک ہیں، ان کے صاحبِ دیوان ہونے کا کسی کو علم نہیں۔فارسی میں کوئی صاحبِ دیوان ہے؟ (ویسے میر صاحب کی مراد اُردو والوں سے ہوگی)۔

(2)'نور باغ' کے لیے بس یہی لکھا جائے گا کہ ہوگا ضرور، مگر احوال معلوم نہیں۔

(3) رہے' کالے پیادے'، تو حبشی دستے والی بات لگتی ہوئی ہے۔کیا یہ بات آپ کے حوالے سے لکھی جاسکتی ہے؟ برلاس مرزا1 کا حوالہ میں نہیں دینا چاہتا، انھوں نے تو بہت کچھ لکھا ہے۔کراچی میں ان کی ایک کتاب دیکھی تھی۔اب اس کے متعلق بات سب ذہن میں بھی نہیں۔

ایک نئی بات: بےنظیر کی شادی دھوم سے ہوئی، اس نے پھر ویسی ہی دھوم دھام سے وزیر زادی کی شادی کی:

دقیقہ نہ چھوڑا کسی بات میں
برابر رکھی چُہل ہر بات میں

کیا لکھنؤ میں'چہل برابر رکھنا' کبھی مستعمل رہا ہے؟ میں نے کہیں نہیں دیکھا۔چہل کے ایک معنی چہل پہل بھی لکھے گئے ہیں ایک لغت میں حوالے کے بغیر، میری غرض یہاں اس کے محاورہ ہونے یا نہ ہونے سے ہے۔ یہ باتیں یہاں ختم ہوئیں۔

دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بیحد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر اس کا ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہ آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی خط ابھی لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اس حصے کو ازسرِ نو لکھوں گا، تا کہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاس داری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بروقت بات سامنے آگئی اور بہ آسانی اسے بنایا جاسکتا ہے۔ میں غیر ضروری بحثوں میں پڑنا ہی نہیں چاہتا کہ یہ علمی کاموں کے لیے غیر سازگار ہوا کرتا ہے۔ آپ اپنے احباب سے اس خط کے حوالے سے یہ سب باتیں کہہ سکتے ہیں؛ البتہ یہ خط صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اس پر غور کر لیجیے کہ جب اس تحریر کو ازسرِ نو لکھا ہی جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں اور فضول باتوں سے ان کی آرائش کی جائے۔ ایسی باتیں بہت جلد ضمنیات کا شکار ہو جایا کرتی ہیں۔ اس بنا پر کیا مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے۔ آپ نے مجھے کالے آقاؤں کا طعنہ دیا ہے جب کہ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کسی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ خیر، حسابِ دوستاں در دل۔ اس پر بھی کبھی بات

آپ منع کر سکتے ہیں۔ وہ بھی نہیں چاہیں گے کہ خواہ مخواہ کی اختلافی بحث کا وہ نشانہ بنیں۔ تحریر بہ ہر طور انھی نے چھاپی ہے۔ اگر اب تک آپ کا غصہ کچھ کم ہو گیا ہو تو خوب ہو۔ میری تجویز آپ مان ہی لیجیے۔ ہاں بھائی! یہ خط میرے آپ کے درمیان ہے اور قطعی طور پر ذاتی ہے۔ اس کے بس ضروری اجزا کا آپ بلا تکلف حوالہ دے دکتے ہیں، مگر خط آپ کی نظروں کے لیے ہے۔

آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔

ہاں، جون تو مجھے بھی راس نہیں آئے گا، بمبئی جانا ہے اس لیے جو ہونا ہے وہاں، مئی ہی میں ہو جائے تو اچھا ہے۔ ورنہ پھر بمبئی سے آنا پڑے گا اور اس میں بہت دقت ہوگی۔ صائمہ بٹیا سے کہیے کہ کھانا بمبئی سے واپسی پر کھاؤں گا، پھر زیادہ بھی کھا سکوں گا اور بد پرہیزی بھی کر لوں گا۔ اس بار تو بس صبح آ کر شام کو واپسی ہوگی رکوں گا نہیں۔ یہاں بھی بعض معاملات ہیں۔ آپ سے جلسے میں تو ملاقات ہوگی ہی۔ میں اسٹیشن سے سیدھے جلسے میں آؤں گا اور وہاں سے بس اڈّے پر، تا کہ جلد تر گھر پہنچ جاؤں۔ مثنوی کی مطبوعہ اشاعتیں بھی پھر دیکھوں گا۔ اس بار نہیں، غالباً بمبئی سے واپسی پر۔

خط فوراً لکھیے، اگر چہ عشرے کا زمانہ ہے، پھر بھی۔

رشید حسن خاں

1۔ مرزا علی اظہر برلاس: انگریزی میں واجد علی شاہ پر دو جلدی کتاب کے مصنف (نیر مسعود)

....

شاہ جہاں پور، 12 مئی 1998

نیر صاحب!

ابھی 5 / مئی کا خط ملا۔ اطمینان ہوا۔ دہلی خط لکھ چکا ہوں۔ 21 مئی کو وہاں جانا ہے انجمن کی میٹنگ میں، اپنے سامنے اس کام کو کرا دوں گا۔ وہ مضمون 'مثنویاتِ شوق' کا تمہیدی حصہ ہے۔ انجمن سے ابھی تک یعنی آج تک میرے خط کا جواب نہیں آیا ہے۔ یہ خط پہلے آیا تھا کہ کتاب چھپ گئی ہے۔ میں نے لکھا کہ اسے فوراً روک دیا جائے، کیوں کہ اس حصے کی کتابت از سرِ نو ہوگی۔ اس خط کے جواب کا انتظار ہے۔ خیر، 21 مئی بھی دور نہیں ہے۔ آپ نے بر وقت توجہ دلائی اس کے لیے ممنون ہوں۔ خدا کرے دہلی والے کچھ شرارت نہ کریں۔ جی لگا ہوا ہے کہ مجھے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ ایک خط آج پھر ابھی لکھ رہا ہوں۔

ہاں برادر! ڈاک کا احوال برا ہے آج کل۔ اگر آپ غیر مناسب نہ سمجھیں تو مخمور کو ایک احتیاطی خط لکھ دیں۔ وہاں جناب.... بھی تو ہیں، ان کی شرارت سے ڈرتا ہوں۔ آپ بھی ان کو خوب جانتے ہیں۔ خط لکھ ہی دیجیے اس وجہ سے۔ احتیاطاً اچھی ہوتی ہے۔

'نوری' سے شوستری صاحب مراد نہیں ہوں گے، بل کہ نہیں ہو سکتے۔ وہ عالمِ دیں اور یہاں بیان ہے راگ و رنگ کا اور ڈھول تاشوں کا۔ میر حسن متعدد مقامات پر رعایتِ لفظی کے بری طرح مارے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ویسا ہی مقام ہے۔ اُردو میں میں نے دیکھ لیا۔ کوئی صاحب دیوان نوری اس زمانے تک نہیں تھا۔ 'تذکرۂ میر حسن' میں صرف دو نوری ہیں، پھٹکر اشعار کے مالک اور بس۔

چہل کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اب مزید اطمینان ہوا۔

جی ہاں! بمبئی میں دو ماہ رہنا ہوگا۔ وہاں سے میں تقریب میں شرکت کے لیے شاید نہیں آ سکوں گا۔ 19 مئی کو ریڈیو اسٹیشن آنا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے پہنچوں گا۔ بھائی، اگر آپ اس وقت وہاں فون کر لیں غزالہ شہناز کو، تو آپ سے بات ہو جائے۔ فوری طور پر واپسی ہوگی۔ ریڈیو سے سیدھا بس اڈّے، موسم کی برداشت اب مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ آپ کی طرف اس دن نہیں آ پاؤں گا 1 صائمہ سے کہیے کہ وہ اہتمام ابھی سے شروع کر دیں، ان کی خاطر مکمل بد پرہیزی کروں گا، مگر ذرا سا وقفہ مل جائے۔ ذہنی طور پر ذرا پریشان ہوں کہ گردن پر پرانی جگہ پر پھر کچھ اٹھان 2 محسوس ہونے لگا ہے۔ یہ چھے ماہ کے علاج سے بالکل ختم ہو گیا تھا، گھبرا کر بمبئی جانے کا پروگرام بنایا، گھر میں کسی کو بھی نہیں معلوم، بتانا مناسب بھی نہیں سمجھا ہے۔ آپ بھی ابھی کسی سے نہ کہیں۔

آپ میری خاطر ایک زحمتِ ناروا اور بے جا گوارا کر لیں گے؟ سیمہ رضوی سے فون پر ذرا سی دیر کے لیے بات کر لیجیے اور ان سے پوچھ لیجیے کہ پروگرام کیا ہے۔ اگر مئی میں نہ ہو تو دس جون کے بعد ہر گز نہ رکھیں، میں بمبئی سے نہیں آ پاؤں گا، یا پھر انھیں ہوائی جہاز کا کرایہ دینا ہوگا، اور اس میں مشکل ہوگی ان کو۔ 12 جون کے بعد کسی تاریخ کو بمبئی جاؤں گا۔ وہاں کا فون نمبر ہے 6102068۔

کل آپ کے خط کا انتظار کروں؟

رشید حسن خاں

1۔ خاں صاحب 19 مئی کو سویرے غیر متوقع طور پر میرے یہاں آ گئے تھے۔ (نیر مسعود)

2۔ اس اٹھان پر کینسر کا شبہ تھا اور اسی کا علاج ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کنٹھ مالا ہے۔ مگر کینسر کا نام بُرا ہوتا ہے۔ خاں صاحب کا علاج کینسر ہی کا ہوتا رہا۔ (نیر مسعود)

....

شاہ جہاں پور، 21 مئی 1998

نیر صاحب!

میں دہلی نہیں جا سکا، رزوریشن کرا لیا تھا، سامان تیار کر لیا تھا، سوا بارہ بجے گھر سے چلنا تھا۔ اچانک گیارہ بجے سینے میں کچھ درد محسوس ہوا اور ذرا سی بے چینی کا احساس ہوا۔ ہمت ٹوٹ گئی، سفر ملتوی ہو گیا۔ نقصانِ مایہ الگ۔ آج بستر پر لیٹا ہوا ہوں۔ ذرا سا سیدھا ہو کر یہ خط لکھ رہا ہوں بستر ہی پر۔ ہائے ہائے! بستر کس کام کے لیے بنا ہے اور میرے حصے میں کیا آ رہا ہے، .....بر تو اے چرخ....

ایک ضروری بات: فرہنگ بنا رہا ہوں، اس میں فارسی اشعار کا ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ شعر بھی ہے (حضرت علی کے لیے)

خدا	نفسِ	پیغمبرش	خوانده	است
اگر	افضلیت	ب کس	مانده	است

کیا یہ لحمک لحمی کی طرف اشارہ ہے؟ یہاں 'نفس' کا ترجمہ کیا ہوگا، اپنی ذات کا حصہ یا کچھ اور۔ چودھری[1] صاحب کے ڈر کے مارے آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ وہ اسے بھی اش اش (عش عش) بنالیں گے۔

نیر صاحب! اس کے بعد جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے، 'امراؤ جان' کا کام تو کرنا ہی ہے کہ اس کے مقدمے میں اپنی صفائی دینا ہے اور اپنی تصحیح بھی کرنا ہے؛ اس کے بعد میں ادبیاتِ اودھ سے کچھ سروکار نہیں رکھوں گا۔ ہر شخص تو شیعہ سنّی کی عینک لگائے بیٹھا ہوا ہے، اس بکھیڑے کو کوم مول لے۔ اب جو کرو تو رام دہائی۔ میں نے 'فسانۂ عجائب'، 'گلزارِ نسیم'، 'سحر البیان'، 'مثنویاتِ شوق' کا کام کیا، یہ سب لکھنوی ادب کا حصہ ہیں اور نسیم کے سوا سب شیعہ ہیں۔ میں نے تو یہ کبھی نہیں سوچا کہ میں سنّی ہو کر یہ کیوں کروں۔ سنّی مصنفین کا انتخاب کیوں نا کروں۔ میرے حاشیۂ خیال میں بھی ایسی بات کبھی نہیں آئی، آ ہی نہیں سکتی تھی، اور میں نے معصوم عن الخطا ہونے کا دعوا بھی نہیں کیا۔ لیجیے 'دعوا' لکھ گیا، اب اس پر چودھری صاحب کی ڈانٹ سننا پڑے گی۔ خدا مجھ پر رحم کرے!! آپ نے یقین ہے کہ مخمور کو خط لکھ دیا ہوگا۔ اس خط کا جواب جلد تر عنایت ہو، تا کہ فرہنگ مکمل ہو سکے۔

رشید حسن خاں

خط میرا ویسے ہی کچا ہے، آج جس طرح لکھ رہا ہوں، اس نے اور خرابی پیدا کر دی ہے۔ آپ کی نظروں کو زحمت اٹھانا پڑے گی اس کی معذرت۔

پس نوشت: خدا نفسِ پیغمبرش خوانده است، یہاں فاعل خدا ہے، بس لیے قولِ رسول تو مراد ہو نہیں سکتا، کوئی آیت مراد ہوگی، وہ کون سی ہے؟

1۔ چودھری سیّد سبطِ محمد نقوی مرحوم کو خان صاحب کی زبان وغیرہ پر کئی اعتراض تھے۔ (نیر مسعود)

....

شاہ جہاں پور، 29 مئی 1998

برادرم!

آج تک جوابِ خط کا انتظار کرتا رہا۔ آج یہ یاد دہانی کا خط لکھ رہا ہوں۔

میں نے اپنے خط میں 'سحر البیان' کا یہ مصرعہ لکھا تھا: 'خدا نقشِ پیغمبرش خوانده است' (منقبتِ حضرتِ علی میں)۔ دریافت طلب بات یہ تھی کہ یہاں کس آیت کی طرف اشارہ ہے دوسرے یہ کہ 'نفسِ پیغمبر' کا اُردو میں ترجمہ کیا ہوگا۔ میری طبیعت بھی ویسی ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کا جواب مجھے جلد تر مل جائے۔ میں 'سحر البیان' سے متعلق سارے ماخذات، سب نسخے اور ضروری کتابیں ساتھ لے جاؤں گا بمبئی، تا کہ وہاں جیسے ہی مہلت ملے، اس کام کو کرتا رہوں۔ اس کا امکان ہے کہ مجھے وہاں کچھ زیادہ وقت لگ جائے۔

بھائی! اس خط کا جواب جلد تر لکھیے۔ ولی الحق انصاری صاحب کا بھی خط آیا ہے۔ ان کو ایک دو دن میں خط لکھوں گا، ذرا سا سکون مل جائے تب۔ یہ لکھ چکا ہوں کہ خرابیِ طبیعت کی بنا پر میں دہلی نہیں جا سکا، آرام کر رہا ہوں، چشم براہ ہوں

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 4 جون 1998

نیر صاحب! آداب

خط مل گیا۔ میرا یاددہانہ کا خط ملا ہوگا، اسے کالعدم سمجھیے۔ میری طبیعت دو گونہ ٹھیک نہیں۔ دہلی نہ جانے کا باعث اسی دلِ نامراد کا اضطراب تھا۔ آٹھ بجے تک ٹھیک تھا۔ بارہ بجے رات کو گھر سے چلنا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے بائیں طرف ہلکی سی خلش محسوس ہوئی اور پھر چُبھن۔ ڈر لگنے لگا، ہمت ٹوٹ گئی۔ رات بھر یہی کیفیت رہی۔ بارے صبح ہوتے ہی آرام آ گیا۔ بمبئی میں جس ڈاکٹر سے دل سے متعلق مشورہ کرتا ہوں، اس نے پچھلی بار انجوگرافی کا مشورہ دیا تھا، مگر وہ کیسے ہو پاتی۔ اب کے جب بمبئی جاؤں گا تو یہ کام بھی دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ ہو جائے گا کہ اب پہلے والی مشکل نہیں رہے گی۔ اس انعام سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہی پہنچے گا۔

ادھر 30 مئی کی رات میں ڈاریا سے نبٹنا پڑا۔ رات میں ڈاکٹر کو آنا پڑا۔ نقاہت اس کی یادگار اب تک ہے۔ آپ کو یاددہانی کا خط بھی بہ مشکل لکھا تھا۔ موسم نے اور طبیعت کے اس انداز نے ہمت پست کر دی ہے۔ بجلی کی کٹوتی سے جان پر بن جاتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ بمبئی میں میرے میزبان نے ملازمت نئی کمپنی میں کر لی ہے، بہتر شرطوں پر، ان کو پچھلا مکان چھوڑنا ہے اور نئے مکان کا انتظام کرنا ہے۔ اس میں شاید کچھ وقت لگے گا۔ جب یہ سب ہو جائے گا، تب جا سکوں گا۔ اس طرح موسم بھی شاید کچھ بہتر ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اب جولائی کے اواخر تک جانا ہوگا، مگر جانا ضرور چاہتا ہوں خاص کر انجو گرافی کے لیے۔

یہ چند سطریں آپ کی فرمائش کی تعمیل میں لکھی ہیں، تاکہ احوالِ دلِ خانہ خراب معلوم ہو جائے۔ خدا کرے آپ اس موسم میں ممکن حد تک بہ عافیت ہوں۔

رشید حسن خاں

....

بمبئی، یکم ستمبر 1998

نیر صاحب! آداب

7 جولائی کا آپ کا خط مجھے کل کی ڈاک سے ملا، سیّد محمد اشرف صاحب کا بھیجا ہوا۔ اس عنایت کے لیے شکر گزار ہوں۔ آپ نے لکھا ہے "آپریشن کی خبر پڑھ کر بہت اطمینان ہوا" میں نے اسے بہ طور پیشن گوئی قبول کر لیا۔ معلوم نہیں یہ خبر کس نے دی کہ آپریشن ہو چکا ہے۔ میرے ڈاکٹر جن کے زیرِ علاج رہا ہوں، اچانک امریکہ چلے گئے تھے، پرسوں واپس آئے۔ آج صبح 9 بجے ان کے یہاں گیا تھا، ابتدائی معائنہ مکمل ہو گیا۔ کل 10 بجے ریڈیالوجی کے سکشن میں جانا ہوگا اور پرسوں ایک اور ٹسٹ کے لیے، ان کی رپورٹ ملنے پر علاج کا تعین ہوگا۔ خیال یہ ہے کہ چار، پانچ دن کے بعد، یعنی سب رپورٹیں ملنے کے بعد علاج شروع ہوگا، جو بھی ہو اور جس طرح کا ہو۔

توقع کرتا ہوں کہ آپ بہ عافیت ہوں گے۔ یہیں دن بھر بارش ہوتی رہتی ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ سنا ہے وہاں بھی یہی احوال ہے۔ میں بمبئی یکم اگست کو پہنچا تھا۔ یہاں سے گھر کب پہنچوں گا، ابھی معلوم نہیں۔ شاید چند روز میں معلوم ہو سکے۔

احوال پرسی کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔

رشید حسن خاں

....

بمبئی، 21 ستمبر 1991

برادرم!

سیّد محمد اشرف صاحب نے آپ کا خط بھیجا تھا، میں فوراً اس کا جواب لکھ دیا تھا۔ آج صبح باقر مہدی صاحب کا فون آیا، اس سے معلوم ہوا کہ میرا خط آپ تک نہیں پہنچا، اس لیے یہ دوسرا خط لکھ رہا ہوں۔

3 ستمبر کو ریڈیالوجی ٹسٹ ہوا تھا، پھر تین دن کے بعد سی. ٹی. اسکین ٹسٹ ہوا ہے پھر ایک اور، اور آخر میں خون کے مختلف ٹسٹ۔ تین ڈاکٹروں سے مشورہ کیا

گیا، کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچا جا سکا۔ [illegible]

میں 26 ستمبر کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور 27/کو شاہ جہاں پور پہنچوں گا۔ خدا کرے آپ بہ عافیت ہوں۔ صائمہ اور ثمرہ کو بہت سی دعائیں۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 10 اکتوبر 1998

برادرم!

آپ کے سبھی خط مل گئے تھے، آج ایک اور خط ملا۔ پچھلے خطوں کی رسید بھیج چکا ہوں۔

میر سمینار کا دعوت نامہ آیا تھا؟ کیسے جاتا، معذرت کر لی۔ نہ ہمت، نہ سکت، نہ فرصت۔ آپ کی ساری باتیں سر آنکھوں پر؛ مگر دہلی میں ایک بار میں نے ایک ڈاکٹر سے ذرا سا اختلاف کیا تھا، اس نے کہا: ڈاکٹر میں ہوں یا آپ؟ اس دن سے ڈاکٹروں کی باتوں سے اختلاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔ ہر چہ باداباد۔ آدمی بہت دن جی کے کرے گا بھی کیا، نامۂ اعمال کے اندراجات میں جتنا کم اضافہ ہو اتنا ہی اچھا ہے۔

مطلوبہ مضمون بھیج رہا ہوں۔ صائمہ کو بہت سی دعائیں اور ثمرہ کو بھی۔

اس لفافے کی رسید کا منتظر رہوں گا۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 17 فروری 1999

نیر صاحب آداب!

3/فروری کا خط ملا تھا۔ تدوین امراؤ جان [1] میری بھی خواہش ہے، مگر وہی بات: ہزاروں خواہشیں ایسی کہ......لندن سے عکس کون منگوائے۔

میں فروری کے اواخر یا مارچ کے اوائل میں دو ماہ کے لیے بمبئی جاؤں گا۔ وہاں سے بہ عافیت واپسی پر اگلے کام کے متعلق کچھ طے کر سکوں گا۔

باقی حالات بدستور ہیں۔ صائمہ اور ثمرہ کو دعائیں۔

رشید حسن خاں

[1]۔ بتایا جاتا ہے کہ 'امراؤ جان ادا' پہلی بار 1899 میں چھپی۔ اس اڈیشن کا عکس مجھے لندن سے بھائی رضا علی عابدی نے بھیج دیا تھا، لیکن اس کے اولین اڈیشن ہونے میں شک پڑ گیا ہے۔ (نیر مسعود)

....

شاہ جہاں پور، 2 اپریل 1999

نیر صاحب آداب

خط ملا تھا۔ 6 اپریل کو بمبئی کے لیے روانگی ہے۔ غالباً وسط جون تک واپسی ہوگی۔ تب تک عابدی صاحب کا خط آ چکا ہوگا۔ میں انتظار کروں گا۔

بمبئی کا پتا ابھی متعین نہیں۔ وہاں جا کر پتا چلے گا۔

صائمہ کا پیار

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 26 مئی 1999

نیر صاحب! آداب

میں کم و بیش ڈیڑھ مہینے کے بعد 22/مئی کو بمبئی سے واپس آیا ہوں۔ ان کتابوں کی واپسی میں بہت تاخیر ہوئی، ناروا تاخیر، اس کے لیے معذرت طلب ہوں۔ ازراہِ لطف اس پیکٹ کی رسید سے مطلع فرمائیے۔ صائمہ کو پیار۔

رشید حسن خاں

5اگست1999

نیر صاحب! آداب

کل آپ کا خط ملا۔ بہت تشویش ہوئی۔مگر اطمنان کی بات یہ ہے کہ اب ان میں سے کوئی بیماری لا علاج نہیں، بہت کم مدّت میں یہ ٹھیک ہو سکتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ پہلے کی طرح بہ عافیت تمام کارفرما ہوں گے۔

خدابخش لائبریری سے میرے پاس کچھ نہیں آیا۔ ہاں فاروقی صاحب کا خط ضرور آیا تھا۔

مجھے یقین ہے کہ اس خط کے پہنچنے تک آپ کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہو گی۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 17 جنوری 2001

نیر صاحب! آداب

10 جنوری کا خط ملا، شکریہ۔ میں بس ٹھیک ہی ہوں۔ اگلے مہینے کسی وقت بمبئی جاؤں گا سالانہ چک اَپ کے لیے۔ کچھ یہ بھی ہے کہ پُرانی تکلیف پھر ذرا اُبھر آئی ہے، اس کو بھی دکھانا ہے۔ میں فروری کے دوسرے ہفتے میں جاؤں گا اور واپسی شاید مارچ میں کسی وقت ہو سکے گی۔

خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔ صائمہ کو خط لکھ دیا تھا۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 4 فروری 2001

برادرم!

خط ملا۔ میری صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی، بس بندگی میں بے چارگی والی بات ہے۔ کام کا آپ نے پوچھا ہے، فی الوقت نذرِ تعطّل ہے۔ کوئی بھی کام نہیں ہو پا رہا ہے۔

آپ کی کامل صحت یابی کا متمنی ہوں۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 7 دسمبر 2001

نیر صاحب! آداب

آپ کا جوابی خط کئی دن پہلے ملا تھا۔ موسمی اثرات کے سبب لکھنا پڑھنا بند تھا، یوں جواب میں تاخیر ہو گئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ جعفر والا کام ختم کے قریب ہے۔ اس کا احوال یہ ہے کہ وہ ابھی شروع بھی نہیں ہوا، پیش رفت کا حال کیا لکھوں۔ بیٹے کے مدرسۂ سلمانیہ میں کلامِ جعفر کا ایک خطی نسخہ ہے، اس کی فکر میں ہوں۔ مل جائے تو کام شروع ہو۔ معلوم نہیں ملے گا یا نہیں۔

چلنا پھرنا میرا ابھی نہ ہونے کے برابر ہے۔

ہاں! اپنے جس خط کا حوالہ آپ نے دیا ہے، ایسا کوئی خط مجھے قطعاً نہیں ملا۔ میں خط کا جواب لکھنا من جملۂ فرائضِ اخلاقیات مانتا ہوں، جواب نہ لکھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ جوابی خط لکھنے پر اب کیا کہوں! خیر، یہ بھی سہی۔ خدا کرے آپ پہلے سے بہتر ہوں۔ صائمہ کو پیار۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 9 جنوری 2002

نیر صاحب! آداب

سکی ہے اور یہی بہت ہے۔اس سے زیادہ اوت کیا چاہیے۔آپ کی صحت کا متمنی ہوں۔خدا کرے سردیوں کے بعد وہ اثرات زائل ہو جائیں۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 31دسمبر 2002

نیر صاحب! آداب

23/دسمبر کا خط ملا،شکریہ۔طبیعت کا احوال پڑھ کر پریشانی ہوئی۔خدا کرے آپ جلد تر پوری طرح صحت یاب ہو جائیں۔

میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ڈاکٹر سے سفر کرنے اور زیادہ چلنے سے منع کر دیا ہے۔یہ بھی کہا ہے کہ پیس میکر جلد تر لگوا لینا چاہیے۔نقاد اور ڈاکٹر کی سبھی باتوں کو ماننا ضروری نہیں سمجھتا۔یوں دواؤں پر اکتفا کر رہا ہوں۔لکھنا پڑھنا بڑی حد تک بند ہے پچھلے ڈیڑھ مہینے سے۔ہاں،زٹلی کا کلیات مرتّب ہو گیا؛مگر اسے چھاپنے والا کوئی نہیں،یوں رکھا ہوا ہے۔اس سے بہت مسرت ہوئی کہ انیسؔ کے متعلق کتاب چھپ گئی۔

آپ کی بحالیِ صحت کا متمنی۔

رشید حسن خاں

....

شاہ جہاں پور، 28اپریل 2003

نیر صاحب! آداب

تاسف نامہ ملا[1]۔آپ کے الفاظ سے بہت سکون ملا،خدا آپ کو خوش رکھے۔خدا کرے آپ کی طبیعت اب ٹھیک ہو۔

رشید حسن خاں

[1]۔بیگم نسیم اقتدار علی نے مجھے مطلع کیا تھا کہ خاں صاحب کی بیگم کی وفات ہو گئی ہے،لیکن وہ اس خبر کو اس لیے عام نہیں کر رہے ہیں کہ پھر انھیں رسمی تعزیت ناموں کے جواب دینا پڑیں گے اور ان کی پریشانی اور بڑھے گی۔میں نے خاں صاحب کو اظہارِ افسوس کا خط لکھا تھا اور یہ بھی لکھ دیا تھا کہ تعزیت نامہ نہیں ہے (نیر مسعود)۔

....

شاہ جہاں پور، 330 مئی 2003 [1]

نیر صاحب! آداب

آج ہی لفافہ ملا۔اگر ذرا سی سکت ہوتی تو صائمہ کو رخصت کرنے والوں میں ضرور شامل ہوتا۔میرے لیے اس بچی کی رخصت شاید بہت زیادہ مسرت کی بات ہے کہ وہ اپنی حقیقی زندگی شروع کرے گی۔خدائے پاک اسے ہمیشہ شادمان و کامران رکھے،اسے نعمتوں سے نوازے اور اس کے شریکِ حیات کو خوش وخرم اور بامراد رکھے۔یہ موقع مسرت وغم کا عجیب آمیزہ ہوا کرتا ہے کہ گھر کی رونق جانے کا غم اور ایک اور گھر کی رونق بڑھانے کی دعائیں۔انسانی زندگی شاید ایسے ہی تضادات سے عبارت ہے۔جب بھی عید آئے گی اور نیا سال آئے گا صائمہ مجھے بہت یاد آیا کرے گی۔میں اسے واقعتاً اپنی بیٹی جیسا سمجھتا رہا ہوں۔وہ جس طرح مجھے یاد رکھتی تھی اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ رہے گا۔خدا اسے ہر حال میں ہمیشہ خوش رکھے اور اپنی نعمتوں سے نوازے اور بہت کامیاب زندگی کی توفیق عطا فرمائے۔

رشید حسن خاں

☆

[1]۔یہ میرے نام رشید حسن خاں کا آخری خط ہے۔صائمہ،ثمرہ کے نام ان کے خط آتے رہے۔6 جنوری 2006 کو انھوں نے ثمرہ کو خط لکھا،اس کے ایک مہینے بیس دن بعد ان کی وفات ہو گئی۔(نیر مسعود)

نوٹ۔ان خطوط میں خال خال ایسے مقامات آئے ہیں جہاں خاں صاحب کے قلم سے کچھ ایسے بے تکلف جملے نکل گئے ہیں جنھیں مصلحتاً حذف کر دینا ضروری تھا۔تاہم ان خطوط کی اصل میں وہ جملے بدستور موجود اور محفوظ ہیں۔ان کے بیش تر خطوط تو وہ ہیں جن کی نقول نیر مسعود کے مضمون میں شامل ہیں اور کچھ خطوط ایسے ہیں جو انجمن کی آرکائوز سے لے کر شامل کیے گئے۔اڈیٹر

(سہ ماہی اُردو ادب، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی صفحہ 197 تا 246، جنوری، فروری، مارچ 2007)

....

''نیّر مسعود

ادبستان، دین دیال روڈ لکھنؤ: 226003

26/فروری، 2006

برادرم اسلم پرویز صاحب اسلام علیکم

رشید حسن خاں بھی رخصت ہوئے۔ میں ان کے پسماندگان میں کسی سے واقف نہیں لہٰذا اس لیے آپ سے تعزیت کر رہا ہوں۔ میری بیٹی کے نام کچھ دن پہلے ان کا خط آیا تھا، وہ ان کو نئے سال کی مبارک باد کا کارڈ بھیجتی تھی جس کے جواب میں وہ خط ضرور لکھتے تھے۔ اسلم محمود صاحب سے بھی ان کی بات دو ہی دن پہلے ہوئی تھی، اس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے۔

نیّر مسعود''

m (سہ ماہی اُردو ادب، سرورق، خصوصی اداریہ، صدیق الرحمٰن قدوائی، صفحہ 5 تا 9، انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی، جنوری، فروری، مارچ 2006)

☆☆☆

نیّر مسعود

خان چاچا

(رشید حسن خاں)

میں نے 1981 میں رشید حسن خاں کی شخصیت پر ایک مضمون میں لکھا تھا۔

''رشید حسن خاں میرے گھر آئے اور آتے ہی انھوں نے میری چھوٹی بچّی صائمہ سے دوستی کر لی، اور بچی بھی فوراً ان سے مانوس ہو گئی۔ اس سے دیر تک باتیں کرنے کے بعد انھوں نے جیب سے ایک نوٹ نکالا۔ میں نے احتجاج کیا تو بولے: آپ برائے کرم اس معاملے میں دخل نہ دیں۔ یہ کوئی تحقیقی مسئلہ نہیں، میرا اور صائمہ کا حساب کتاب ہے۔ اس کے بعد سے وہ تقریباً ہر خط میں صائمہ کو ضرور یاد کرتے ہیں اور جب بھی مجھ سے ملنے آتے ہیں، فوراً اس کو بلواتے ہیں: 'ارے بھئی آپ کہاں تھیں؟ ہم اتنی دیر سے آپ کو پوچھ رہے تھے۔ آیئے ہمارے پاس بیٹھیے، یہ بات ہوئی۔ ہاں تو برادر، فسانۂ عجائب کا متن تین سو صفحوں میں آیا ہے۔ اور ملحقات چار سو صفحوں میں، اس صورت میں...''

(اظہار ممبئی، 1984)

صائمہ اس وقت سوا تین سال کی تھی۔ خاں صاحب آتے تو چپکے سے آ کر ان کے پیچھے کھڑی ہو جاتی۔ میں اشارے سے ان کو متوجہ کرتا تو وہ آہستہ سے کہتے، دیکھ رہا ہوں، اور مجھ سے باتیں کرتے رہتے، پھر پوچھتے، آج صائمہ نہیں ہیں؟ اچانک ان کے سامنے آ جاتی اور وہ گویا چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

اس وقت خاں صاحب کے خطوں میں صائمہ کا ذکر بار بار ہوتا تھا۔ ''صائمہ کو پیار۔ بہت پیاری بچّی ہے۔'' ''بچّی کی طبعیت کیسی ہے آپ کا خط چوں کہ نہیں آیا اس لیے تشویش ہے۔ براہِ کرم صورت حال سے مطلع کیجیے۔'' صائمہ کی بیماری طویل کھینچ گئی تھی۔ ایک بار اس کی حالت کچھ زیادہ بگڑ گئی، بار بار غفلت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک بار اس نے غفلت سے چونک کر کہا ''ہمیں خان چاچا کے پاس بھیج دیجئے۔'' جب خاں صاحب کو میں نے یہ واقعہ بتایا تو انھوں نے صائمہ کو بیٹی بنا لیا اور مجھے لکھا:

''صائمہ اب ٹھیک ہیں، اس سے بے حد مسرت ہوئی۔ خود آ کر ان کی ضدیں دیکھوں گا۔''

زمانہ وہ تھا کہ فسانہ عجائب کا قضیہ زوروں پر تھا۔ یہ کتاب دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو کی جانب سے تیار کی گئی تھی اور اس کی تدوین کا سارا کام تنہا رشید حسن خاں نے کیا تھا، مگر شعبے کا اصرار تھا کہ اس پر مرتب کی حیثیت سے شعبۂ اُردو کا نام دیا جائے اور دیباچہ میں خاں صاحب کا شکریہ ادا کر دیا جائے کہ کتاب کی تیاری میں سب سے زیادہ حصہ ان کا ہے۔ خاں صاحب اس پر راضی نہیں تھے اور اس قضیے کی وجہ سے عرصے تک کتاب کی اشاعت التوا میں پڑی رہی۔ اس زمانے میں ان کے خطوں میں اس کا حوالہ بہت ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں ان کا ایک خط صائمہ کے نام آیا شفقت آمیز خط، لیکن اچانک ان کا تخاطب مجھ سے ہو گیا اور کچھ اس طرح: ''صاحب فسانۂ عجائب تیار ہے لیکن یہ شعبے کے مخلند وس، گوڈڑ کے فلاں.... '' وغیرہ، اور اسی طرح کے نادر خطابات سے خط بھرا ہوا تھا۔ 2/ مارچ 1991ء کا لکھا ہوا ایک خط میرے سامنے ہے۔

''12/ مارچ منگل کے دن حاضری دوں گا.... اگر صبح تڑکے والی گاڑی مل گئی تو پھر ناشتا آپ کے ساتھ ہوگا، ورنہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پہنچوں گا۔ اسٹیشن سے سیدھا دین دیال روڈ، وہاں سے امین آباد اور پھر وہاں سے اسٹیشن۔ یہ سب یوں لکھا ہے کہ (1) آپ صائمہ کو مطلع کر دیں (2) ناشتے کا انتظام یا اہتمام احتیاطاً رکھیں۔''

(اب صائمہ اتنی بڑی ہو چکی تھی کہ خاں صاحب کے ناشتے کے لیے کوئی چیز خود پکاتی تھی)

یکم نومبر 1996 کے خط میں لکھتے ہیں:

''صائمہ اور ثمرہ کو دُعائیں۔ دونوں سے کہنا کہ نیا سال بس آنے ہی والا ہے۔''

ثمرہ میری چھوٹی بیٹی ہے۔ 1996 میں وہ نو سال کی ہو گئی تھی۔ صائمہ کی دیکھا دیکھی وہ بھی خاں صاحب کی بیٹی بن بیٹھی تھی۔ دونوں بچیاں باقاعدگی سے خاں صاحب کو نئے سال کا (اور کبھی عید کا بھی) کارڈ بھیجتی تھیں۔ خاں صاحب ان تہنیت ناموں کا بڑی محبت سے جواب دیتے اور خود بھی کارڈ بھیجتے تھے۔ اگر کسی وجہ سے کارڈ نہیں پہنچتا تھا تو یاد دہانی کرتے تھے۔ مثلاً:

''صائمہ کی بہت سی دعائیں اور ثمرہ کو بھی۔ دونوں نے دنوں سے خبر نہیں لی۔ میں بھی خط نہیں لکھ سکا۔ اس آنے جانے کی رواداری میں اور ہنگاموں میں۔ انھوں نے معمول کے خلاف اب کے نئے سال کا کارڈ بھی نہیں بھیجا۔''

(23 اکتوبر 1997)

رشید حسن خاں صاحب کی صحت بگڑ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ مکمل تندرست نہیں رہے، لیکن اس حال میں انھوں نے تدوین کے کئی کارنامے انجام دیے اور صائمہ ثمرہ کو خط بھی لکھتے رہے۔ جب صائمہ نے ایک ٹوٹا پھوٹا افسانہ لکھا تو خاں صاحب نے ڈاک کے ذریعے اسے ایک نوٹ انعام میں بھیجا۔ اس کے بعد وہ صائمہ کی تصنیفی سرگرمیوں کے بارے میں برابر پوچھتے تھے۔ کچھ خط حسب ذیل ہیں:

8 جنوری 1997

ثمرہ بیٹی کو بہت سی دُعائیں۔ نیا سال مبارک

تمھارا بہت پیارا خط ملا۔ پڑھ کر میرا جی بہت خوش ہوا۔ تم نے بہت اچھا خط لکھا ہے۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔ تمھاری سال گرہ پر تم کو بہت سے تحفے ملے اس کا حال پڑھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ میں تو وہاں تھا نہیں اور تم نے مجھے سال گرہ کا بتایا بھی نہیں، ورنہ میں بھی کوئی تحفہ دیتا۔ سال گرہ تو نکل گئی اب تو وہ ایک سال بعد آئے گی۔ مگر عید آنے والی ہے۔ تمھاری عید کے -/20 اس لفافے میں رکھ دیے ہیں انھیں اپنے پاس رکھنا اور اپنی امی کو نہ دینا۔ نہیں تو وہ بینک میں جمع کر دیں گی۔

اس گھر میں ہماری ایک اور بھتیجی تھی۔ نام تھا صائمہ۔ تم ان کو جانتی ہو؟ ان سے تمھاری ملاقات ہوتی ہے؟ اگر کسی دن ملاقات ہو تو میری طرف سے بہت سی دُعائیں پہنچا دینا۔ تمھارے ایسے ہی پیارے سے خط کا انتظار رہے گا۔

رشید حسن خاں

......

13 جنوری 1998

پیاری بیٹی صائمہ کو دُعائیں۔

آج ہی تمھارا بھیجا ہوا کارڈ ملا۔ بہت خوشی ہوئی۔ تم کیسی ہو؟ پڑھائی کیسی ہو رہی ہے؟ تمھارا تو نام ہی ''صائمہ'' ہے۔ یوں تم تو روزے ضرور رکھ رہی ہوگی۔ اب تو سردی کا موسم ہے۔ روزے رکھنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ اللہ میاں تو بہت اچھے اور مہربان ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنے بندوں کو بہت سی آسانیاں دی ہیں۔ خاص کر بچوں کو اور لڑکیوں کو، کہ وہ روزہ رکھ کر بھی چائے پی سکتی ہیں اور سب سے چھپ کر پانی بھی پی سکتی ہیں۔ بس کھانا نہیں کھا سکتیں۔ ہاں لڑائی جھگڑا کرنے پر پابندی ہے مگر مار پیٹ پر کچھ پابندی نہیں۔

اور ہاں، تم نے کیا مضمون لکھنا اور کہانی لکھنا چھوڑ دیا ہے؟ تم نے ادھر میرے پاس اپنی لکھی ہوئی کوئی چیز بھیجی نہیں۔ مجھے بہت انتظار رہتا ہے۔ کہانیاں لکھنا بہت اچھی بات ہے۔ اب جب کوئی مضمون یا کہانی لکھنا تو مجھے ضرور اطلاع دینا مجھے اس سے بہت خوشی ہوگی۔ بہت سی دُعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں

......

30 مارچ 1998

''صائمہ کو الگ سے خط لکھوں گا۔ ان کے ہاتھ کا پکا ہوا ضرور کھاؤں گا۔ اس کام کو مکمل کرتے ہی وہاں آؤں گا۔ صائمہ کو مجھ سے ضرور شکائت ہوگی، مگر مطمئن رہیے۔ بہت آسانی سے انھیں منالوں گا۔ وہ بہت اچھی بٹیا ہے۔''

30 مارچ 1998

صائمہ کو بہت بہت دُعائیں۔

توقع ہے کہ تم اچھی ہوگی اور امتحان کی تیاری پوری ہو چکی ہوگی۔ تمھارے ہاتھ کا کھانا کھانے کو بہت جی چاہتا ہے، مگر یہ جانتا ہوں کہ تم آج بھی امتحان کی تیاری میں لگی ہوگی، اس لیے تم کو دودِلا کرنا نہیں چاہتا۔ جب تم امتحان سے فرصت پالوگی تب آؤں گا۔ تا کہ اطمینان سے بہت عمدہ کھانا تیار کر سکوں۔

ثمرہ کیسی ہیں؟ ان کو بھی دُعائیں۔ ان کا بھی امتحان ہو رہا ہوگا۔ ان کو اکثر یاد کرتا ہوں۔ اور ہاں، تم نے ایک دفعہ کے بعد پھر اپنی کوئی تحریر نہیں بھیجی۔ کیا اس کے بعد کچھ نہیں لکھا؟ اب میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ جب تم پہلے کی طرح کچھ لکھ کر بھیجو گی تب میں آؤں گا۔ بہت سی دُعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں

......

11 جنوری 1999

پیاری بیٹی صائمہ کو بہت سی دُعائیں۔

تمھارا بھیجا ہوا کارڈ ملا۔ ایسا خوب صورت کارڈ ہے کہ آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی اسے دیکھ کر۔ جیتی رہو اور ہمیشہ خوش رہو۔ دُعا کرتا ہوں کہ نیا سال تمھارے لیے کامیابی مسرتیں اور راحتیں لائے۔ امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرو۔ اپنی امّی سے میرا سلام کہو۔ تم مجھے ہمیشہ یاد آتی ہو اب میری یہ کاہلی ہے کہ تم کو کارڈ نہیں بھیج پاتا۔ کیا کروں! مگر یہ بات ضرور ہے کہ ہر نئے سال کی آمد پر دل میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ صائمہ بٹیا کا کارڈ آتا ہی ہوگا۔ بہت دن جیو، بہت خوش رہو۔ بہت سی دُعاؤں کے ساتھ۔

رشید حسن خاں ......

11 جنوری 1999

پیاری بیٹی ثمرہ کے لیے ہزاروں دُعائیں اور بے شمار نیک تمنائیں۔

تمھارا بھیجا ہوا بہت پیارا کارڈ ملا، جسے دیکھ کر تمھارے لیے دل سے دُعا نکلی۔ تم مجھ کو یاد رکھتی ہو اور یاد بھی کرتی ہو۔ ہر نیا سال تمھاری محبت کا نذرانہ لے کر آتا ہے۔ کسی شخص کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو یاد رکھا جائے۔ تمھارے لیے بہت سی دُعائیں۔ مجھے

یقین ہے کہ تم اسی طرح ہمیشہ نئے سال پر اپنے خان چاچا کو یاد کرتی رہوگی۔
خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے۔ اپنی امّی سے میرا اسلام کہو اور اپنے ابّو سے بھی۔
رشید حسن خاں

......

18 جنوری 1999
عزیزہ صائمہ!
میرے دونوں خط تم کو اور ثمرہ کو مل گئے ہوں گے۔ میری پوتی سعدیہ نے تم دونوں کے لیے اپنے ہاتھ سے جو کارڈ بنائے تھے وہ بھیج رہا ہوں۔ سعدیہ چوتھے درجے میں پڑھتی ہیں اور تم دونوں کو پیار بھرا اسلام کہہ رہی ہے۔
رشید حسن خاں

......

11 جنوری 2000
بہت پیاری بھتیجیوں صائمہ اور ثمرہ کو بہت بہت دُعائیں۔
آج تمھارا عید کارڈ ملا۔ بہت جی خوش ہوا اور تم دونوں کے لیے دل سے دُعائیں نکلیں کہ خدائے پاک تم ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔ بہت لائق و فائق بنائے اور بہت شہرت عطا کرکے کہ تم اپنے گھر کا نام اور روشن کرسکو۔ یہاں سردی بہت پڑ رہی ہے۔ وہی بات کہ؛
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
دن بھر انگیٹھی کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ لکھنا پڑھنا سب بند ہے دس بارہ دن سے۔ وہاں کا احوال بھی ایسا ہی ہوگا۔ تمھاری تعلیم وتربیت کا احوال تو معلوم ہے۔ مگر تمھاری مضمون نگاری کا حال دنوں سے معلوم نہیں ہوا۔ بہت دن ہوئے جب تم نے ایک مضمون بھیجا تھا، جسے پڑھ کر بہت مسرت ہوئی تھی۔ اب تک تو کئی اچھے مضمون جمع ہو گئے ہوں گے میں اس دن بہت شوق کے ساتھ انتظار کروں گا جب تمھارے مضمون رسالوں میں پڑھوں گا اور پھر تمھاری کتابیں دیکھوں گا۔
اپنی امّی سے میرا اسلام کہو خدا تم کو ہمیشہ شاد ماں رکھے اور تم اسی طرح مجھے مبارک باد کے کارڈ بھیجتی رہو۔
رشید حسن خاں ......

8/جنوری 2000
پیاری بیٹی صائمہ کو ڈھیر ساری دُعائیں
تمھارا بھیجا ہوا کارڈ مل گیا۔ تم ہمیشہ یاد رکھتی ہو اور یاد کرتی ہو۔ تمھارے لیے دل سے دُعا نکلتی ہے کہ تم خوب پڑھو، خوب لکھو اور ہمیشہ خوش وخرم رہو اور ترقی کرتی رہو۔ کارڈ بہت خوب صورت ہے۔ میں نے اسے حفاظت کے ساتھ میز کے نیچے محفوظ کرلیا ہے۔
بہت سی دُعاؤں کے ساتھ
رشید حسن خاں

......

23 اگست 2000
عزیزہ صائمہ! دُعائیں
اسلم محمود صاحب کا خط کل آیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نیر صاحب بیمار ہیں اور اسپتال میں داخل ہیں۔ اس سے بہت تشویش ہوئی۔ تم پوری صورت حال لکھ کر بھیجو کہ اب وہ کیسے ہیں۔ خدا کرے بالکل ٹھیک ہو سکتے ہیں۔
رشید حسن خاں

......

31 دسمبر 2002

پیاری بٹیا ثمرہ کو درازیِ عمر کی بہت سی دُعائیں۔

کارڈ ملا۔ میں تو بس انتظار ہی کر رہا تھا کہ ثمرہ کا کارڈ آتا ہی ہوگا۔ کیسا جی خوش ہوتا ہے۔ تمھارا کارڈ پا کر۔ تم یاد رکھتی ہوا پنے خان چاچا کو اور یاد کرتی ہو اس موقع پر، اس لیے نئے سال کے ساتھ تمھاری یاد بھی آتی ہے اور دل سے دعا نکلتی ہے۔ خدا تم کو ہمیشہ خوش رکھے اور تم ہر سال اسی طرح یاد کرتی رہو۔

رشید حسن خاں

......

31 دسمبر 2002

پیاری بیٹی صائمہ کو بہت بہت دعائیں

(سرنامے میں بہت اچھی اور ہمیشہ یاد رکھنے والی بیٹی صائمہ کے لیے)

کارڈ ملا۔ اب میں ایسا کارڈ کہاں سے لاؤں۔ یوں خط لکھ رہا ہوں۔ تم تو اب بڑی ہو گئی ہوگی۔ اچھے اچھے کھانے بھی پکانے لگی ہوگی (اپنے گھر کی روایت کے مطابق)۔ کوشش کروں گا کہ کبھی وہاں آکر تمھارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھاؤں اور تم کو دعائیں دوں۔ ہر سال کے خاتمے پر اپنے آپ یہ خیال دل میں آجاتا ہے کہ صائمہ کا کارڈ آتا ہوگا، اور وہ آجاتا ہے۔ جیتی رہو اور خوش رہو۔ نیا سال مبارک ہو۔

رشید حسن خاں

حقیقتاً صائمہ بڑی ہوگئی تھی، اتنی کہ یہ خط ملنے کے دوسرے سال 20 مئی 2000 کو اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کا کارڈ رشید حسن خاں کو بھی گیا۔ میں نے کارڈ پر یہ بھی لکھ دیا کہ: ''آپ کی بیٹی رخصت ہو رہی ہے، اسے دعائیں دیجیے۔'' 30 رمئی کو خاں صاحب کا خط آیا۔

نیّر صاحب! آداب

آج ہی لفافہ ملا۔ اگر ذرا سی سکت ہوتی تو صائمہ کو رخصت کرنے والوں میں ضرور شامل ہوتا۔ میرے لیے اس بچّی کی رخصت شاید بہت زیادہ مسرّت کی بات ہے کہ وہ اپنی حقیقی زندگی شروع کرے گی۔ خدائے پاک اسے ہمیشہ شادمان کامران رکھے اسے نعمتوں سے نوازے اور اس کے شریکِ حیات کو خوش و خرم اور بامراد رکھے۔

یہ موقع مسرّت و غم کا عجیب آمیزہ ہوتا ہے کہ گھر کی رونق جانے کا غم اور ایک اور گھر کی رونق بڑھانے کی دعائیں۔ انسانی زندگی شاید ایسے ہی تضادات سے عبارت ہے۔ جب بھی عید آئے گی اور نیا سال آئے گا، صائمہ مجھے بہت یاد آیا کرے گی۔ میں اسے واقعتاً اپنی بیٹی جیسا سمجھتا رہا ہوں۔ وہ جس طرح مجھے یاد رکھتی تھی، اس کا نقش میرے دل پر ہمیشہ رہے گا۔ خدا اسے ہر حال میں خوش رکھے اور اپنی نعمتوں سے نوازے اور بہت کامیاب زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رشید حسن خاں

صائمہ اپنی شادی سے کچھ پہلے دو تین افسانے لکھ کر مقامی اخبار میں چھپوائے تھے۔ اپنی سسرال (دہلی) سے اس نے رشید حسن خاں کو ان افسانوں کی عکسی نقلیں بھیجیں۔ عید اور سالِ نو کے کارڈ بھی ان کو بھیجتی رہی۔ یکم دسمبر 2004 کو اس کے یہاں بیٹا ہوا۔ اس کی تصویر بھی خاں صاحب کو بھیجی۔ خاں صاحب کو ان میں سے جو چیز بھی ملی اس کی رسید میں انھوں نے بہت محبت بھرا خط لکھا۔ لیکن یہ خط دہلی بھیجے گئے تھے اور مجھے دیکھنے کو نہیں ملے۔ البتہ جنوری 2005 میں اس اور ثمرہ نے لکھنؤ سے نئے سال کے کارڈ بھیجے اور ان کا جواب لکھنؤ کے ہی پتے پر آیا۔

12 جنوری 2005

پیاری بیٹیوں صائیمہ اور ثمرہ کو بہت بہت دعائیں۔

میں کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ اب کے صائمہ نے بھلا ہی دیا اور ثمرہ نے بھی انھی کا ساتھ دیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہوا ہر سال کے شروع ہی میں آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں کہ صائمہ اور ثمرہ کا لفافہ آتا ہی ہوگا جو اس قدر خوب صورت ہوگا کہ اسے دیکھتے ہی آنکھوں کی روشنی بڑھ جائے گی۔ کئی دن گزر گئے اور کوئی ایسا لفافہ نہیں آیا جسے دور ہی دیکھ کر آنکھیں پکار اٹھیں کہ اسے تو ہماری بیٹیوں نے بھیجا ہے۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ پھر اچانک کل 11 رجنوری کو وہ لفافہ آ گیا۔ جی خوش ہو گیا اسے دیکھتے ہی۔ دل سے دعا نکلی کہ تم دونوں ہمیشہ خوش و خرم رہو۔ یہ سال بھی خوشی کا پیغام لانے والا بن

رشید حسن خاں

اس سال 2006 میں ثمرہ نے لکھنؤ سے اور صائمہ نے دہلی سے خاں صاحب کو تہنیتی کارڈ بھیجے۔ ثمرہ کے کارڈ کا جواب آ گیا۔ (صائمہ کا لفافہ معلوم نہیں کیوں اس کے پتے پر واپس آ گیا) ثمرہ کے نام خط میں ان کی تحریر ذرا بگڑی ہوئی ہے۔ اپنا نام بھی انھوں نے خلافِ معمول پورا نہیں لکھا۔ خط حسبِ ذیل ہے:

6 جنوری 2006

پیاری بیٹی ثمرہ ہمیشہ خوش رہو۔

پرسوں تمھارا بھیجا ہوا بہت خوب صورت کارڈ ملا۔ بہت جی خوش ہوا۔ دل سے دُعا نکلی کہ تم ہمیشہ خوش و خرم اور بامراد رہو۔ میری طرف سے بھی نیا سال تم کو اور گھر کے سب لوگوں کو مبارک ہو۔ دعا یہ ہے کہ آنے والا سال پچھلے سال کی طرح نہ ہو۔

صائمہ کہاں ہیں؟ ان کو میں نے اب کے بہت یاد کیا۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ تم اور صائمہ دونوں اپنے متعلقین کے ساتھ عافیت رہو اور اپنی امّی اور اپنے ابا سے میرا اسلام کہو۔

تمھارا چاچا رشید حسن،،

یہ خط لکھنے کے ایک مہینہ بیس دن بعد رشید حسن خاں کی وفات ہوگئی۔ واقعی یہ سال پچھلے سال کی طرح نہیں ہے۔ وہ سال جس میں رشید حسن خاں نہ ہوں پچھلے سال کی طرح کیوں کر ہوسکتا ہے۔ خود میرے نام رشید حسن خاں کے بہت سے دل چسپ، بے تکلفانہ اور عالمانہ خطوط ہیں۔ اس طرح کے خطوط اور بھی بہتوں کے نام ہوں گے لیکن یہ خط جو خان چاچا نے اپنی بھتیجیوں کو لکھے ہیں، مجھے ان کے عام خطوں سے زیادہ عزیز ہیں۔

(ماہ نامہ، نیا دور لکھنؤ، جلد 62، نمبر 9، دسمبر 2007، صفحہ 8 تا 12)

(منتخب مضامین، نیر مسعود، زیرِ اہتمام، آج کی کتابیں، سٹی پریس بک شاپ، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400، پہلی اشاعت 2009، صفحہ 215 تا 244)

ضمیمے

ضمیمہ (1)

رشید حسن خاں

مثنویاتِ نوّاب مرزا شوقؔ لکھنوی
کیا یہ سرگزشت ہیں

یہ سوال زیرِ بحث رہا ہے کہ شوقؔ لکھنوی کی مثنویات (فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق) کا ہیرو کون ہے۔ یہ سوال خاص کر یوں اٹھا ہے کہ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ اِن مثنویوں میں شوقؔ نے اپنی سرگزشت بیان کی ہے۔ جو تحریریں میرے سامنے ہیں اِن کے مطابق اِس سلسلے میں سب سے پہلے مولانا حالیؔ نے اظہارِ خیال کیا ہے، لیکن حالیؔ کی

ظاہر کی ہے وہاں شوقؔ کی مثنویوں کا بھی ذکر آ گیا ہے، لکھتے ہیں:

''میر حسنؔ کے بعد نوّاب مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنویاں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل ہیں۔ اِن میں سے تین مثنویوں میں اُس نے اپنی بوالھوسی اور کام جوئی کی سرگزشت بیان کی ہے، یا یوں کہو کہ اپنے اوپر افترا باندھا ہے''۔

''یا یوں کہو'' لکھ کر حالیؔ نے اپنے قول ''تین مثنویوں میں اِس نے اپنی بوالھوسی اور کام جوئی کی سرگزشت بیان کی ہے'' کی صراحت کو ختم کر دیا۔ ''اپنے اوپر افترا باندھا ہے'' کا صاف مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے۔ اِس عبارت کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حالیؔ نے خود شوقؔ کو اِن مثنویوں کا ہیرو بتایا ہے۔ حالیؔ نے ایسا اندازِ بیان اختیار کیا ہے کہ جس میں کسی خیال کو قطعیت حاصل نہیں۔

جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ حالیؔ نے خود شوقؔ کو اِن مثنویوں کا ہیرو مانا ہے، اُنھوں نے حالیؔ کے قول کے دوسرے جز کو نظر انداز کر دیا اور یوں مبتلاے غلط فہمی ہوئے۔ اِس سلسلے میں دو قول پیش کرنا کافی ہوگا۔ عطاء اللہ پالویؔ نے ''تذکرۂ شوق'' میں لکھا ہے کہ ''حالیؔ نے ''مقدّمہ'' میں مثنویاتِ شوق کا ہیرو خود شوق کو بتایا'' (ص ۱۱۱) اور اس کے بعد مقدّمے کی وہی عبارت نقل کر دی ہے جسے اوپر درج کیا گیا ہے۔ مجنوںؔ گورکھپوری نے ''مقدّمۂ زہرِ عشق'' میں لکھا ہے:

''حالیؔ نے نہ جانے کس واعظانہ دُھن میں زہرِ عشق کو بھی بہارِ عشق اور فریبِ عشق کی طرح شوقؔ کی ہوس کاریوں کا ایک دفتر سمجھا ہے... قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق کا ہیرو ایک ہی شخص ہے۔ میں حالیؔ کی طرح یہ کہنے کی جرأت نہیں رکھتا کہ یہ حضرت خود مرزا شوقؔ تھے، حالاں کہ اِس خیال کی تردید بھی مشکل سے ہو سکتی ہے''۔

اِن دونوں حضرات (پالویؔ اور مجنوںؔ) نے حالیؔ سے قطعیّت کے ساتھ وہ بات منسوب کی ہے جسے خود حالیؔ کی عبارت کی روشنی میں اُن سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ حالیؔ نے اپنی طبیعت اور اپنے مزاج کے عین مطابق ایک بین بین بات لکھی ہے، جو ''یوں بھی ہو سکتا ہے اور یوں بھی'' کے تحت آتی ہے۔ اس سے کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا۔

حالیؔ کے برخلاف مولانا عبدالماجد دریابادی نے واضح لفظوں میں یہ کہا ہے کہ یہ مثنویاں شوقؔ کی اپنی سرگزشت ہیں۔ بہارِ عشق اور زہرِ عشق کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دونوں میں نہ کوئی پلاٹ ہے نہ طلسم کشائی۔ نہ شاعر منبر پر بیٹھ کر اخلاق کا وعظ کہہ رہا ہے نہ کالج کے لکچر روم میں تحلیلِ نفسیاتی کر رہا ہے۔ اسے محض اپنی سیہ کاری و بوالھوسی کی کہانی سنانی ہے اور یہی وہ خوب مزے لے لے کر سنا رہا ہے۔ پھر چوں کہ محض آپ بیتی سنانی ہے، اِس لیے جگ بیتی سنانے والوں کی طرح کسی دوسرے کو عاشق فرض کرنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئی ہے''۔

(''اُردو کا ایک بدنام شاعر'' مشمولہ زہرِ عشق، مجنوں اڈیشن، ص ۵۷)

مصنّفِ شعر الہند نے تو اِس سلسلے میں کوئی راے ظاہر نہیں کی، لیکن خم خانۂ جاوید کے مولّف نے اِس پر اظہارِ خیال کیا ہے:

''یہ مختصر مثنویاں گویا اُس زمانے کی رندیت اور عیاشانہ زندگی کا کھیے (کذا) عشق بازی کا دفتر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اِن مثنویوں کا موضوع خیالی مضمون آرائی نہیں، بل کہ آپ بیتی وارداتیں ہیں''۔

(جلد پنجم، ص ۱۰۳)

اِس عبارت سے ہماری معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا۔ مولّف نے ''کہا جاتا ہے'' لکھ کر اپنا دامن صاف بچا لیا ہے، کوئی راے نہیں دی اِس طرح اُن کی عبارت اِس بحث میں ہمارے کام نہیں آ سکتی۔

حالیؔ نے جو کچھ لکھا تھا اور جس طرح لکھا تھا، وہی بات بدلی ہوئی شکل میں کئی جگہ ملتی ہے۔ میں بس ایک حوالے پر اکتفا کروں گا بقیہ کو اِسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے:

''شوقؔ کی مثنویوں کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اُن کا اپنا واقعہ ہے جس کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اُن کے حالات زیادہ نہیں معلوم ہیں، اِس لیے کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، لیکن شوقؔ نے آپ بیتی کا رنگ اختیار کر کے قصّے کو اتنا اصل بنا دیا ہے کہ ہمیں واقعے کا شبہ ہونے لگتا ہے''۔

(خواجہ احمد فاروقی، بہ حوالہ ''تذکرۂ شوق'' ص ۱۱۲)

شوقؔ پر سب سے پہلی مفصّل اور قابلِ قدر کتاب عطاء اللہ پالوی کی تذکرۂ شوق ہے (ناشر: مکتبۂ جدید لاہور، سالِ طبع: ۱۹۵۶ء۔ یہ پہلا اڈیشن ہے اور میری معلومات کی حد تک یہ کتاب دوبارہ نہیں چھپی)۔ پالویؔ صاحب نے اپنی کتاب میں بہت شد و مد کے ساتھ لکھا ہے کہ یہ مثنویاں دراصل شوقؔ کی آپ بیتیاں ہیں، وہ خود اِن کے ہیرو ہیں۔ اُن کے اِس اصرارِ بے حد کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُن کی راے میں شوقؔ نے یہ مثنویاں لکھنؤ کے بگڑے ہوئے معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔ بات میں اثر پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ بہ طورِ مثال اپنی سرگزشت لکھتے ہیں۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:

نگاری صرف ایسی ہی ذات کے لیے ممکن تھی جو یا تو اِس قدر پست ہو کہ سوسائٹی میں اپنی بے عزتی کا کوئی احساس نہ رکھتا ہو یا پھر اتنا بلند ہو کہ ایک طرف تو شاہی عتاب اور اُمرائے لکھنؤ کے انتقام کی زد سے محفوظ رہ سکے اور دوسری جانب وہ عوام وخواص میں اتنا اثر رکھتا ہو کہ باہمہ تلخ نوائی اُس کی طرف انگلی نہ اٹھائی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ذات خود شوقؔ ہی کی تھی، لہٰذا اُنھوں نے بلا تکلف اور بغیر جھجک اپنے ہی واقعات بہ تفصیل پیش کر دیے، تا کہ کذب و اِفترا کہہ کر ٹال دینے کی گنجایش بھی نہ رہ سکے‘‘۔ (ص ۱۱۴)

اِس کے بعد اُنھوں نے اپنے اِس خیال کی مزید توضیح اِن الفاظ میں کی ہے:

’’اخلاق کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ احتساب خود اپنی ذات، اپنی جماعت، اپنی قوم اور اپنی سرزمین سے شروع کرنا چاہیے۔ دوسروں کی اخلاقی کمزوریوں پر ہنسنے والوں کو پہلے اپنی ذات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اِس لحاظ سے جب شوقؔ نے اپنے شہر کی بداخلاقیوں کو طشت از بام کرنا چاہا تو سب سے پہلے اپنی ذاتی روئداد پیش کی اور باتوں ہی باتوں میں سارا راز کھول کر رکھ دیا‘‘۔ (ایضاً، ص ۱۱۵)

شوقؔ نے یہ مثنویات معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں اور اِسی کی خاطر اُنھوں نے اپنے ہی واقعات کو نظم کیا ہے۔ اِس مفروضے پر رائے ظاہر کرنے سے پہلے مناسب یہ ہوگا کہ اِس بحث کے ایک اور اہم پہلو پر غور کر لیا جائے، اِس سے صحیح صورتِ حال کے تعیّن میں مدد ملے گی۔

اِس سے اتّفاق کیا گیا ہے کہ زبان کی خوبی اور بیان کے حُسن کے لحاظ سے شوقؔ کی مثنویوں میں بہارِ عشق کو افضلیت حاصل ہے۔ فحش نگاری، عریاں نگاری اور ’’ام مورل‘‘ ہونے کا جو الزام شوقؔ پر لگایا گیا ہے، وہ بھی دراصل اِسی پر مبنی ہے۔ وصل بالجبر کی جیسی تفصیلات بہارِ عشق میں ہیں اور جیسا بے محابا اندازِ بیان اِس میں اختیار کیا گیا ہے، فریبِ عشق میں تو اِس کا عشرِ عشیر بھی نہیں، اور زہرِ عشق کا تو عالم ہی جدا ہے، وہ تو دنیا ہی دوسری ہے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ فریبِ عشق میں بیانِ وصل کی تفصیلات کی جگہ جو طویل مکالمہ ہے، بل کہ یوں کہا جائے کہ ہیروئن کی زبان سے عاشق کی فیل بازی اور جعل سازی پر خاص خواتین کی زبان میں جو کچھ کہلوایا گیا ہے، اُس کی حیثیت جانِ سخن کی ہے۔ اِس لحاظ سے بہارِ عشق کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، کیوں کہ شوقؔ پر جس قدر اعتراضات کیے گئے ہیں اور اُسے مطعون کیا گیا ہے، اُن سب کا مرکز یہی مثنوی ہے، اِس لیے یہ مناسب طریقِ کار ہوگا کہ اِس مثنوی کی وجہِ تصنیف کا تعیّن کر لیا جائے، اِس سے صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔

بہارِ عشق کی پہلی اشاعت (سلطان المطابع، ۱۲۶۰ھ) کے آخر میں دو نثری عبارتیں ہیں جو بعد کے نسخوں میں نہیں ملتیں۔ اِس مثنوی کی وجہِ تصنیف کے تعیّن میں ان عبارتوں کی بنیادی حیثیت ہے۔ چوں کہ یہ عبارتیں اِس مثنوی کی بعد کی اشاعتوں میں شامل نہیں ہو سکیں، اِس لیے بیش تر لوگ اِن کے مطالب سے بے خبر رہے ہیں۔ اِس مثنوی کی واقعی وجہِ تصنیف معلوم نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی رہی کہ یہ عبارتیں نگاہوں کے سامنے نہیں رہیں۔ پہلی عبارت کا عنوان ہے ’’نثر مصنّف‘‘ یہ آٹھ سطری عبارت ہے، اِس کا ابتدائی حصہ نقل کیا جاتا ہے:

’’اِس ذرۂ بے مقدار کو منظور یہ تھا کہ محاورات صاحبات محل اور نوچندی کے لوگوں کے کچھ بیان کرے، لہٰذا یہ مثنوی مخصوص اسی واسطے کہی اور الفاظ غلط کہ اِن لوگوں کے محاورات میں جاری تھے، موزوں کیے اور موافق قول اساتذہ کے اِن کو صحیح سمجھ کر جاری رکّھا‘‘۔

مصنّف کا اپنا بیان یہ ہے کہ میں نے یہ مثنوی اِس غرض سے لکّھی ہے کہ صاحباتِ محل اور نوچندی میں شرکت کرنے والوں (مردوں عورتوں) کے محاورات، یعنی اُن کی بول چال اور طرزِ گفتگو بیان کیا جائے۔ اُس نے وضاحت کے ساتھ، بل کہ تاکیدی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ ’’یہ مثنوی مخصوص اِسی واسطے کہی‘‘۔ اب یا تو کوئی ایسی دلیل لائی جائے جس کے سامنے مصنف کا یہ واضح بیان باطل ٹھہرے اور ناقابلِ قبول قرار پائے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا اور یہ واقعہ ہے کہ ایسی کوئی دلیل موجود نہیں، اِس صورت میں اِس بیان کو تسلیم کرنا ہوگا۔

دوسری عبارت: اسی نسخۂ طبعِ اوّل کے آخر میں ’’نثر خاتمہ‘‘ کے عنوان سے بھی ایک عبارت ہے، اِس کے یہ اجزا توجہ طلب ہیں:

’’حکیم نواب مرزا صاحب... نے حسبِ استدعا دوستاں اور بہ فرمایش عمدۃ الاکابر نواب ابوتراب خاں صاحب بہادر... اِس دُرِ شاہوار اور گوہرِ آبدار کو رشتۂ نظم میں منسلک کیا اور بہارِ عشق نام رکھا... حق تو یوں ہے کہ ابتدائے اُردوے معلّی سے آج تک ایسی نظم مسلسل شعرائے سابق وحال کی نظر سے بہت کم گزری ہوگی اور کسی نے محاورات مستوراتِ محل کے بہ ایں لطافت وفصاحت کبھی نہ سنے ہوں گے... حسبِ فرمان واجب الاذعان نواب صاحب ممدوح یہ نسخہ قالبِ طبع میں آیا‘‘۔

اِس عبارت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی بعض احباب، خاص کر نوّاب ابوتراب خاں کی فرمایش پر لکّھی گئی تھی اور پہلی بار اُنھی کے حکم کے مطابق شائع ہوئی تھی۔ محاورات مستوراتِ محل کی صراحت یہاں بھی موجود ہے۔

اِن دونوں عبارتوں سے اِس مثنوی کی وجہِ تصنیف واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے۔ جب تک ان بیانات کی تردید نہ کی جا سکے، اُس وقت تک اِنھیں لازماً تسلیم کیا جاتا رہے

گا۔ اِس طرح یہ کہنا کہ شوقؔ نے مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھّی تھیں، کوئی معنی نہیں رکھتا اور ضمنی طور پر یہ بات بھی بے اصل ٹھہرتی ہے کہ اُن کی اپنی

سرگزشت ہیں۔

اِن دونوں باتوں سے بڑھ کر ایک اور بات ہے۔ بہارِ عشق میں ایک پہلو ایسا ہے جس کی طرف کسی نے توجّہ نہیں کی اور اِس پر مجھے بہت تعجّب ہے۔ یہ ایسی بات ہے جس کی بنیاد پر بہ آسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرگزشت شوقؔ کی اپنی تو ہو ہی نہیں سکتی۔ مثنوی کے آخر میں یہ لکھا گیا ہے کہ کسی شادی میں شوقؔ بھی مدعو تھے اور وہ خاتون بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ شوقؔ زیرِ دیوار جا پہنچے اور دونوں میں شکوے شکایت ہونے لگے۔ ہیروئن کے گھر والے ''دیکھ یہ حال ہوگئے حیراں''۔ جب اور کچھ نہ بن آئی تو یہ مشورہ کیا گیا کہ ''شادی ان دونوں کی جو ہو جائے کچھ تو منہ سے سیاہی دھو جائے''۔ آخر کار ''ہوگئی دھوم دھام سے شادی''۔ یعنی وہ خاتون جن کو گھیر گھار کر لایا گیا تھا اور وصل کا اہتمام کیا گیا تھا اور اس کی تفصیلات کو مزے لے لے کر بیان کیا گیا تھا، وہ کوئی اور نہیں، خود شوقؔ کی بیگم صاحبہ تھیں۔ اگر یہ مانا جائے (جیسا کہ پالویؔ صاحب نے مانا ہے) کہ اِن مثنویوں میں شوقؔ نے اپنی سرگزشت بیان کی ہے، اُس صورت میں اِس بات کو بھی لازماً ماننا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ نوّاب مرزا شوقؔ ہوں یا ویسا ہی کوئی دوسرا شخص، اِس کا اعلان کرنا کبھی پسند نہیں کرے گا کہ اُس کی بیوی وہی ہے جس کے ساتھ زنا بالجبر کیا جا چکا ہے۔

اگر اِس مفروضے کو مان لیا جائے کہ شوقؔ نے آپ بیتی بیان کی ہے، اُس صورت میں کیا عقلِ سلیم یہ ماننے پر آمادہ ہو سکتی ہے کہ طبقۂ اشرافیہ کا ایک فرد شادی کے بعد بہ بانگِ دُہل یہ اعلان کرے کہ یہ جو ہماری بیگم صاحبہ ہیں، یہ وہی ہیں جن سے ناجائز تعلّقات رہ چکے تھے۔ وہ پورے قصّے کو دُہرائے، جنسی عمل کی تفصیلات لکھے اور یہ بتائے کہ ان محترمہ کا ماضی کیا تھا۔ بہ قائمیِ ہوش و حواس اِس کو ماننا بہت مشکل ہے۔ شوقؔ تو طبقۂ شرفا سے تعلّق رکھتے تھے، اُس زمانے کا ہو یا اِس زمانے کا، کوئی اوسط درجے کا شخص بھی اپنی بیوی کے متعلّق ایسی باتیں نہیں لکھ سکتا۔

بہارِ عشق، فریبِ عشق اور زہرِ عشق تینوں مثنویوں میں شوقؔ نے ایک ہی پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے کہ اپنے آپ کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہے اور پوری کہانی سنائی اِس طرح ہے جیسے آپ بیتی ہو۔ یہ بیان کا ایک خاص انداز ہے۔ اِس طرح کہانی میں حقیقت کا رنگ نمایاں ہو سکتا ہے اور سننے والوں پر زیادہ اچھا اور گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اِس پیرایۂ بیان کو حقیقت بیانی پر محمول کرنا اور سچ مچ اسے بیان کرنے والے کی آپ بیتی سمجھ لینا، اندازِ بیان کے اسرار و رموز سے ناآشنائی کا اعلان کرتا ہے۔

اگر یہ درست ہے کہ بہارِ عشق میں شوقؔ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اُن کی اپنی سرگزشت نہیں، اُس صورت میں یہ بات خود بہ خود واضح ہو جائے گی کہ باقی دونوں مثنویوں میں بھی بیان کا یہی انداز ہے۔ فریبِ عشق میں جب ہیروئن کہتی ہے: ارے تو ہی نواب مرزا ہے، تو اِسے ادائے مفہوم کا ایسا انداز ماننا چاہیے جس نے اِس پیرایۂ اظہار کی گویا تکمیل کر دی ہے اور اِس طرزِ ادا کو شوقؔ کے خاص محاسن میں شمار کرنا چاہیے۔

شوقؔ نہ تو واعظ تھے نہ ریفارمر۔ وہ تو اُس طبقے سے تعلّق رکھتے تھے جس میں لذّت اندوزی زندگی کا اصل مقصد بن کر رہ گئی تھی۔ وہ اُس معاشرے میں رہتے تھے جس میں حصولِ لذّت کے وسائل کم نہیں تھے۔ حسین آباد کا جلسہ ہو یا درگاہ حضرت عباس میں شب بیداری اور عبادت کے نام پر آنے والے مہ جبینوں کے جمگھٹے، یہ سارے مقامات اُن کے دیکھے بھالے تھے۔ وہ جس طرح حسینوں کے انداز و اطوار سے خوب واقف تھے، اُسی طرح اِن کے روزمرّہ اور محاورے کے اور گھات کی باتوں کے بھی خوب رمز شناس تھے۔ مزاج بھی تماش بینوں والا پایا تھا۔ اُردو کی معروف عشقیہ مثنویاں پڑھ چکے تھے، خاص طور پر مومنؔ کی مثنویاں، جن میں جسم اور جنس کا بیان بہت لذّت بخش تھا، خاص کر وصل کے بیانات۔ پھر خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی میر اثرؔ کی مثنوی خواب و خیال تھی، جس میں سراپا کے تحت ستر تک کی تفصیل موجود تھی اور مواصلت کی تفصیلات تو تھیں ہی، ہاتھا پائی میں ہانپتے جانے اور چھوٹے کپڑے اُتارتے جانے کا بھی بیان تھا۔ کچھ دوستوں کی ترغیب، کچھ ابوتراب خاں جیسے رئیس کی فرمائش، ان سب پر مستزاد مذکورہ بالا مثنویوں کی شہرت اور مقبولیت کا طاقت ور احساس، اِن سب نے مل کر ایسی مثنوی لکھنے کی تحریک پیدا کی جس میں نوچندی میں آنے والے خواتین کے محاوروں اور روزمرّہ کا زیادہ سے زیادہ بیان سما جائے۔ ساتھ ہی نوچندی، درگاہ اور حسین آباد کی وہ جھلکیاں نگاہوں کے سامنے آجائیں جن سے وہ راتیں رنگین بن جایا کرتی تھیں۔ شاعر بیگانہ آشنا یا دور کا تماشائی نہیں تھا، رنگ و رامش کے اُن دُھندلکوں کے اسرار سے خوب واقف تھا اور فضا ایسی تھی جس میں ایسے بیانات کے سرسبز ہونے اور مقبولِ عام ہونے کے سارے اسباب موجود تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں:

> ''لکھنؤ ہے اور واجد علی شاہ ''جانِ عالم'' کا لکھنؤ۔ ہر لب پر گل کا افسانہ، ہر زبان پر بلبل کا ترانہ، ہر سر میں عشق کا سودا، ہر سینے میں جوشِ تمنّا۔ ہر طرف رندی و سرمستی کا جوش و خروش، ہر گوشۂ بساط دامانِ باغباں و کفِ گل فروش۔ اِس جنّت نگاہ و فردوس گوش کی فضا میں ایک صاحب حکیم تصدق حسین نامی آنکھیں کھولتے ہیں۔ عالمِ دین نہیں، صوفی و درویش نہیں، مصلحِ معاشرت نہیں، ایک یار باش، زندہ دل، رند مشرب آدمی۔ اہلِ بزم کے خوش کرنے کو شعر و شاعری کا ساز لے کر بیٹھے تو اُنگلیاں اُنھیں پردوں پر پڑیں جن کے نغمے کانوں میں رچے ہوئے تھے اور منہ سے بول نکلے تو وہی جن کے نقشے آنکھوں میں جمے ہوئے تھے''۔

(اُردو کا ایک بدنام شاعر، مشمولہ زہرِ عشق، مجنوںؔ اڈیشن، ص ۵۴)

موقعے کے بیان کو لیجیے جب اُن کے دوست ہیروئن کے گھر پہنچتے ہیں۔ پیغام سن کر وہ صاحبہ خود چلی آتی ہیں اور گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ دو چار یا دس بیس جملوں پر مشتمل نہیں، یہ خاصی لمبی بات چیت ہے۔ اُن کے دوست نے ''کچھ کہا چکے، کچھ پکار پکار''۔ وہ صاحبہ پہلے تو آگ بگولہ ہو گئیں اور سنانے پر اُتر آئیں، سنائیں بھی خوب، خیر پھر اُن کا دل پسیجا۔ مثنوی کے آغاز میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ خود امیر زادی ہے، یعنی کسی معمولی خاندان کی لڑکی نہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اجنبی سے دروازے پر کھڑے کھڑے ایک شریف خاندان کی بن بیاہی لڑکی اتنی دیر تک ایسی باتیں کرتی رہے۔ کیا گھر میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ ایسے بعض مقامات اور بھی ہیں۔ مگر بات وہی ہے کہ مثنوی لکھنے والے کا مقصد باضابطہ کہانیاں لکھنا تھا ہی نہیں، اُس کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ صاحباتِ محل اور صاحباتِ نوچندی کے زیادہ سے زیادہ محاورے یک جا ہو جائیں اور اُن کی زبان کے زیادہ سے زیادہ لفظ جمع کر دیے جائیں اور اس میں وہ کامیاب رہا ہے۔

اِن مثنویوں میں خواتین شروع سے آخر تک محوِ سخن طرازی ملتی ہیں۔ مثلاً بہارِ عشق میں ہیروئن جب باغ میں آ جاتی ہے، اُس کے بعد وہی بولتی رہتی ہے۔ یہ حصّہ غیر ضروری حد تک طویل ہے، اِس کی طوالت کھٹکتی بھی ہے مگر شاعر کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایسے مواقع پر صاحباتِ نوچندی کے زیادہ سے زیادہ محاورے بیان میں آ جائیں اور زیادہ سے زیادہ الفاظ اُن کی زبان سے ادا ہوں۔ ایسے مقامات جہاں عورت کو سنے دے سکتی ہے، بُرا بھلا کہہ سکتی ہے اور الفاظ میں بیزاری کا اظہار کر سکتی ہے، شاعر نے وہاں خاص کر طوالت سے کام لیا ہے۔ مثلاً فریبِ عشق میں سوال وصل پر انکار اور اعتراض اور پھر اظہارِ ناراضی والا حصّہ خاصا طویل ہے۔ بہارِ عشق میں بھی یہی حصّہ بہت طویل ہے۔ کیسے کیسے کوسنے دیے گئے ہیں، قسمیں دی گئی ہیں، منّت کی گئی ہے، غصّہ کیا گیا ہے، ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ یہ حصّہ غیر ضروری بل کہ غیر مناسب حد تک طویل ہے، لیکن اِسی حصّے میں اور ایسے ہی حصّوں میں تو عورتوں کی زبان کے جوہر کھلتے ہیں اور لفظوں کی کاٹ تلوار کی آب داری کی حریف بن جاتی ہے، اِسی لیے شاعر نے دانستہ یہ طریقۂ کار اختیار کیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اُن حصّوں میں خواتین کی زبان کے جوہر خوب کھلے ہیں اور اُنھی حصّوں کی وجہ سے اِن مثنویوں نے فروغ پایا ہے۔ اِسی بنا پر ایسے اجزا کی طوالت پر یا اُن کی شوخ بیانی پر اعتراض نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہی شاعر کا اصل مقصد تھا۔ شوخ نگاری اور تفصیل نگاری کا یہ انداز نہ ہوتا تو یہ مثنویاں زبان و بیان کی روشن اور متحرک تصویریں بھی نہیں بن پاتیں۔

حالیؔ نے مقدّمے میں لکھا ہے: ''افسوس ہے شوقؔ کی مثنویوں کی اِس سے زیادہ اور کچھ داد نہیں دی جا سکتی کہ جو شاعری اُس نے ایسی ام مورل مثنویاں کے لکھنے میں صَرف کی ہے، اگر وہ اُس کو اچھی جگہ صَرف کرتا اور روشنی کے فرشتے سے تاریکی کے فرشتے کا کام نہ لیتا تو آج اُردو زبان میں اُس کی مثنویوں کا جواب نہ ہوتا''۔

اِس سے ذرا پہلے شوقؔ کی مثنویوں کے متعلّق وہ یہ لکھ چکے تھے کہ یہ مثنویاں ''حشو اور بھرتی کے الفاظ سے بالکل پاک ہیں... اِن میں مردانے اور زنانے محاوروں کو اِس طرح برتا ہے کہ نثر میں بھی ایسی بے تکلّفی سے آج تک کسی نے نہیں برتا... جو کچھ اِس نے بیان کیا ہے، وہ مورل ہو یا ام مورل، اِس میں حسنِ بیان کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے''۔

حسنِ بیان کا حق اِسی لیے ادا ہو پایا کہ شاعر نے مورل اور ام مورل جیسی اضافی پابندیوں پر توجّہ کرنے کے بجائے زبان اور بیان پر توجّہ مرکوز رکھی ہے۔ شوقؔ نے جو پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے، اُس میں اتنی وسعت اور گنجایش ہے کہ ''مردانے اور زنانے محاوروں'' کو زیادہ سے زیادہ جگہ مل جائے۔ اگر روشنی کے فرشتے سے روشنی ہی پھیلانے کا کام لیا جاتا اور شاعر افلاطونی عشق ہی بگھارتا رہتا، تو اِس کا امکان تو ہو سکتا تھا کہ یہ مثنویاں ''ام مورل'' نہ ہوتیں، مگر یہ طے شدہ ہے کہ ''محاورات صاحباتِ محل اور نوچندی کے'' اس رنگارنگی اور اِس کثرت کے ساتھ معرضِ بیان میں نہ آ پاتے۔ خوبیِ زبان اور حسنِ بیان کے یہ، مرقّعے تیّار نہیں ہو سکتے تھے اور ہم زبانِ لکھنؤ کے ایک وسیع الذّیل پہلو سے نا آشنا رہتے۔

اِس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اِن مثنویوں کے متعلّق یہ رائے قائم کرنا کہ یہ شاعر کی سرگزشت ہیں اور شوقؔ خود ہیرو تھے اِن مثنویوں کے، درست نہیں۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ شوقؔ نے یہ مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں۔ شوقؔ اگر زندہ ہوتے اور اُن پر یہ الزام لگایا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ ضرور دائر کر دیتے۔ وہ اُس طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے جو ایسے جلسوں کو اور ایسی لطف اندوزیوں کو اور ایسی جنسی کامیابیوں کو تہذیبی زندگی کا جز مانتا تھا۔ آج ہم اپنے زمانے میں بیٹھ کر جو بھی کہیں اور اخلاقیات کے جس سبق کو چاہیں دُہراتے رہیں، مگر اُس معاشرے کے آداب و اطوار بالکل مختلف تھے۔ اُس تہذیب میں ایسے سارے مظاہر کی حیثیت زندگی کے لازمی حسین اجزا کی تھی اور اُن سے لطف اندوز ہونا خوش ذوقی کی پہچان تھی۔ شوقؔ اِس قدر تنگ نظر، تہذیب نا آشنا اور زندگی بیزار نہیں تھے کہ اس معاشرے میں ناصحِ ناداں اور واعظ کم فہم بن کر اپنی بد ذوقی کا اعلان کرتے۔ ''راہِ نجات'' کے لکھنے والے اور بہارِ عشق و زہرِ عشق کے لکھنے والے الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔ معاشرے میں گنجایش دونوں کے لیے ہوتی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ شاعر کی حیثیت واعظ سے برتر ہوتی ہے۔ معاشرے کی عکاسی شاعری میں مل سکتی ہے، پند و وعظ میں نہیں اور اِس لحاظ سے شوقؔ کی برتری مسلّم ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے بعض حسین ترین اجزا کا بہترین عکاس ہے۔ اِس کی شاعری جیسی بھی ہے، ہے وہ سچّی کہ اپنے معاشرے کی آئینہ داری کرتی ہے۔ جیسا وہ معاشرہ تھا، اس شاعری کو بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا اور یہ ویسی ہی ہے۔ اِسے رسمی اخلاقیات کے پیمانے سے ناپنا، خوش ذوقی کی جان پر ستم ڈھانا ہے۔

(ماہنامہ ''ایوانِ اُردو''، دہلی، جولائی ۱۹۹۶ء، ص ۶ تا ۱۰)

☆☆☆

ضمیمہ (2)

رشید حسن خاں

مثنویاتِ شوق
لکھنوی معاشرت کے آئینے میں

نوّاب مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں (فریبِ عشق ، بہارِ عشق ، زہرِ عشق) اُن کی اپنی سرگزشت ہیں، اِس سے تو اختلاف کیا گیا ہے اور بجا طور پر؛ لیکن اِس بات سے شاید ہی کسی نے اختلاف کیا ہو کہ یہ مثنویاں اُس زمانے کی لکھنوی معاشرت کی بعض جہتوں کی بہترین ترجمان ہیں۔ یہ گویا تمثال دار آئینے ہیں۔ اِن میں تہذیبی روداد اور شاعری کا ارتکاز ایک نقطے پر نظر آتا ہے اور اِس تہذیبی روداد کے پس منظر میں اودھ کی سیاسی تاریخ کے بعض طاقت ور اثرات کا بہ خوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں، چند اشارے کافی ہوں گے، یوں ہی یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں۔

اودھ کی حکومت، جس کے آخری فرماں رواجانِ عالم پیا واجد علی شاہ تھے، اِس کے پہلے حکمراں نوّاب برہان الملک تھے؛ جو نسباً سیّد تھے، شیعہ تھے، ایرانی النسل تھے؛ اولوالعزم، بہادر اور جنگ جو تھے۔ تلوار زندگی بھر اُن کے ہاتھ میں رہی اور زندگی کا بڑا حصّہ میدانِ جنگ میں گزرا۔ مغل دربار میں ان کی بڑی حیثیت تھی۔ اودھ کی حکومت کی سند اُن کو حسبِ معمول مغل بادشاہ سے ملی تھی؛ مگر سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہندستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ایسا علاقہ مل گیا تھا جہاں دہلی کے مغل دربار کی طرح اُمرا کی، خاص کر ایرانی و تورانی امیروں کی وہ کش مکش نہیں تھی جس نے اورنگ زیب کے نااہل اور کم زور جانشینوں کے زمانے میں مغل حکومت کو اختلافات اور تباہی سے بُری طرح دوچار کر رکھا تھا۔ فیض آباد اِس نئی حکومت کا مرکز تھا۔ لکھنؤ کی اُس وقت کیا حیثیت تھی، اِس کا کچھ اندازہ لکھنؤ کے متعلق میر حسؔن کے اِس شعر سے کیا جاسکتا ہے:

زبس کوفے سے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو، بد ہے

نوّاب شجاع الدّولہ اِس سلسلے کے تیسرے حاکم تھے، مگر بکسر کی لڑائی (۱۱۷۸ھ/۱۷۶۴ء) میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد اُن کی اُس مضطرب زندگی کا بڑی حد تک خاتمہ ہوگیا جس نے اُن کو حکومت اور میدانِ جنگ کی تدبیروں میں مصروف رکھا تھا۔ تلوار تو اب بھی اُن کے ہاتھ میں تھی اور فوجوں کے پرے بھی جمے ہوئے تھے؛ لیکن اُن کی زیادہ توجّہ فیض آباد کی آراستگی اور طوائفوں کی سرپرستی کی طرف مبذول ہوکر رہ گئی۔ یہاں شرؔر کے الفاظ نقل کرنا مناسب ہوگا:

"شجاع الدّولہ کا طبعی میلان مہ جبیں عورتوں اور رقص وسرود کی طرف تھا، جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طوائفوں کی شہر میں اِس قدر کثرت ہوگئی کہ کوئی گلی کوچہ اِن سے خالی نہ تھا اور نوّاب کے انعام واکرام سے وہ اِس قدر خوش حال اور دولت مند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرے دار تھیں، جن کے ساتھ دو دو، تین تین عالی شان خیمے رہا کرتے تھے اور نوّاب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے، تو نوّابی خیموں کے ساتھ ساتھ اُن کے خیمے بھی شاہانہ شکوے سے چھکڑوں پر لدلد کے روانہ ہوتے اور اُن کے گرد دس دس، بارہ بارہ تلنگوں کا پہرا رہتا۔

جب حکم راں کی یہ وضع تھی، تو تمام اُمرا اور سرداروں نے بھی بے تکلّف یہی وضع اختیار کرلی اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اِس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقّی ہوگئی، لیکن اِس میں شک نہیں کہ اُن شاہدانِ بازاری کی کثرت اور اُمرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بہ درجہا بڑھ گئی"۔

(گزشتہ لکھنؤ، مکتبۂ جامعہ، دہلی اڈیشن، ص ۵۱)

یہیں سے عیش طلبی کی اُس روایت کا آغاز ہوتا ہے، جس نے بعد کے حکمرانوں کے زمانے میں خاص کر نصیر الدین حیدر کے زمانے میں بہت فروغ پایا، اور مزید ترقّی پاکر واجد علی شاہ کے عہد میں کسی کو کسی اور کام کار کھا ہی نہیں تھا۔ عیش، تفریح اور لذّت اندوزی کو زندگی کا واحد مقصد بنا دیا تھا۔

شجاع الدّولہ کے جانشین آصف الدّولہ تھے۔ اُن کو ورثے میں تلوار کے بجائے صرف عیش طلبی ملی تھی۔ وہ اپنے اجداد کے عزم وہمّت سے تہی دامن اور مجہول تعیّش کے جذبات سے سرشار تھا۔ اِس یک رُخے پن کے اثر سے وہ توازن ختم ہوگیا تھا جو زندگی کو لطف اندوزی اور سخت کوشی، دونوں جذبات سے سرشار رکھا کرتا تھا، نسائیت اور مجہولیت کو دور رکھتا ہے اور کسی ایک دائرے کا قیدی نہیں بننے دیتا۔

اودھ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اُس وقت آیا جب انگریزوں نے اپنی تدبیر جہاں بانی کے تحت اودھ کے حکم راں غازی الدین حیدر کو بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔ برہان الملک کے زمانے سے اُس وقت تک اودھ کے حکمراں "نوّاب وزیر" کہلاتے تھے اور اپنے کو رسماً اور روایتاً سلطنتِ دہلی کا ماتحت تصوّر کرتے تھے۔ یہ لازم تھا کہ اِس تبدیلی کے بعد یہ نئی بادشاہت ہر لحاظ سے یہ کوشش کرے کہ اِس روایتی زیردستی کے سارے نقش مٹ جائیں اور یہاں وہ سب کچھ نئے انداز کا اور اپنے انداز کا ہو جس سے ایک طرف بادشاہت کے تصوّر کی تکمیل ہوتی ہے اور دوسری طرف ایک متمائز معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ عسکریت کی روایت پوری طرح ختم ہوچکی تھی۔ زمین کے مالک تو بہ ظاہر بادشاہ سلامت تھے، لیکن زمین کی محافظ فوج کے مالک انگریز تھے۔ رزیڈنٹ بہادر کی مرضی کے خلاف کوئی نیا فرماں روا اِس نئے تختِ بادشاہت پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ اہم سیاسی اور فوجی مسائل ومعاملات کی وسعت ختم ہوچکی تھی البتہ مذہبی آزادی پوری طرح باقی تھی اور تہذیبی وسعت بڑھتی جاتی تھی۔

اِس کے بعد یہی ہوسکتا تھا کہ جتنی تبدیلیاں، ایجادیں اور اضافے ہوں، وہ سب مذہبی رسوم، آدابِ معاشرت اور ادبی روایات سے متعلّق رہیں اور یہی ہوا۔ اِس میں شک نہیں کہ جلد ہی لکھنؤ میں ایک نئی معاشرت کا خاکہ تیّار ہوگیا، تہذیب کا ایک نیا انداز سامنے آنے لگا، شاعری میں ایک نیا انداز نمایاں ہونے لگا اور ایک نئی لسانی روایت بننے لگی؛ مگر تہذیبی مظاہر کی نمود اور (تہذیبی) تشکیل وارتقا کا عمل تو بہت سست رفتار ہوا کرتا ہے۔ طویل مدّت درکار ہوتی ہے مختلف عناصر کو تہ نشیں ہونے کے لیے۔ اگر کوشش کرکے چیزوں کی شکل صورت کو بدل دیا جائے تو پھر مجموعی طور پر تصنّع اور ساختگی کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا۔ سطح پر بہت کچھ ہوگا جو تاب ناک ہوسکتا ہے، مگر حقیقتاً وہی عالم ہوگا جیسے سارے نقش ریت پر بنائے گئے ہوں۔

اِس نئی تہذیب اور اِس نئے معاشرے کی جس طرح نمود ہوئی اور جن حالات میں کم سے کم مدّت میں اُس کو فروغ حاصل ہوگیا، تو اِس میں یہی کمی تھی کہ ظاہر سب کچھ تھا،

باطن خالی تھی۔ اِس معاشرے میں ظاہر آرائی اور ظاہر داری پر جو اِس قدر زور ملتا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

ہاں ایک چیز ضرور ایسی ہے جس نے دیرپا اثرات پیدا کیے، اور وہ ہے مذہبیت کی طاقت و روایت، جس کا تعلّق حقیقی طور پر باطن سے ہوتا ہے۔ مذہب کے اثرات افراد کے احساس کا جز ہوتے ہیں اور پورے گروہ کی زندگی پر حاوی رہتے ہیں۔ عمل کتنا ہی کم ہو، عقیدہ ذہن کی تہوں میں پیوست رہا کرتا ہے۔ اودھ میں مذہبیت کا فروغ خاص حالات میں ہوا تھا اور در پردہ اِس میں بھی دہلی کے مقابلے میں ایک نئی آزادیِ اظہار کا احساس شامل تھا۔ اِسی احساس نے مذہبیت کے مظاہر کو بھی خارجی زندگی سے قریب تر رکھا اور عرفان سے زیادہ اظہار ان کا اہم جز رہا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایسی بہت سی مذہبی رسمیں پیدا ہو گئیں جن کا حقیقتاً مذہب سے لازمی تعلّق نہیں تھا۔ چوں کہ فرماں روایانِ وقت نے اِن کو اختیار کیا تھا، اس لیے عوام میں ان کا مقبول ہونا لازمی تھا۔ مذہبی عناصر نے، جن کے بے محابا اظہار اور فروغ کے لیے دہلی کی فضائیں تنگ معلوم ہوتی تھیں اور وہاں ایک کش مکش کا سا عالم رہا کرتا تھا، اس نئی مملکت میں نئے مظاہر اور نئی نئی رسموں کی شکل میں فروغ پایا اور یہ پوری معاشرت پر چھا کر رہ گئے یہی وجہ ہے کہ ہندستان کے دوسرے علاقوں کے برخلاف یہاں تولاّ اور تبرّا نے خاص حیثیت پالی۔ تعزیہ داری کا رواج بڑھا، مرثیہ خوانی تہذیبی اور ادبی زندگی کا جز قرار پائی اور مجلسوں نے تہذیبی اداروں کی سی اہمیت حاصل کرلی۔ عزاداری، سوزخوانی، امام باڑے، کربلا، درگاہ حضرت عباس، مرثیے کی مجلسیں، یہ سب تہذیبی مظاہر کا درجہ رکھتے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ ایک طرف تو عیش طلبی اور لذّت کوشی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی اور دوسری طرف عزاداری کا عروج تھا اور اِس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سے معاشرے کا حسن کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ اِن عناصر نے بھی تضاد اور ثنویت، یعنی دُہرے پن کو معاشرت کا نہایت حسین جز بنا دینے میں بہت کامیابی حاصل کی اور تصنّع کو فروغ بخشا۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، عسکریت کے فقدان کے سبب معاشرے میں توازن نہیں تھا۔ نفاست نے بڑھتے ہوئے نسائیت سے اپنے کو قریب تر کرلیا تھا۔ شرّر کے الفاظ میں:

> ''چوں کہ اب سپہ گری و جنگ جوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی۔ عیش پرستی اور عورتوں کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی، اس لیے مردوں پر عورتوں کی وضع کا اثر پڑنے لگا جو اعتدال سے باہر ہو گیا اور جس قسم کی زینت و آرایش عورتوں کے لیے موزوں ہے، مردوں نے اپنی وضع اور لباس میں اختیار کرنا شروع کردی، خصوصاً اُس زمانے میں جب کہ یہاں کے حکم رانوں نے اپنے لیے 'نوّاب' کا لفظ چھوڑ کر 'بادشاہ' کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور سالار جنگی خاندانوں کے لوگ جو معتد بہ وثیقے اور پنشنیں پاتے تھے، بالکل خانہ نشیں کردیے گئے تو اِن کو سوا عورتوں کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اِن کی وضع و لباس ہی میں زنانہ پن نہیں پیدا ہوا، بل کہ ان کی زبان بھی عورتوں کی سی ہو گئی اور چوں کہ وہی شہر کے رئیس اور وضع دار تصوّر کیے جاتے، لہٰذا اکثر عوام نے بھی اِنھیں کی پیروی شروع کردی اور بہ خلاف دیگر مقامات کے رئیسوں کے، یہاں لکھنؤ میں یہ عام وضع ہو گئی کہ سر پر مانگ، اِس پر مسالے کی کام دار ٹوپی، کانوں تک بال، جن کی کنگھی کرنے میں ماتھے پر دونوں طرف پٹیاں جمائی جاتیں۔ منہ میں پان، ہونٹوں پر لاکھا، پنڈے میں تین تین کمر توئیوں کا چست انگرکھا، اس کے نیچے گل بدن کا ریشمی کھنچا ہوا گھٹنّا۔ ہاتھوں میں منہدی، پاؤں میں ٹاٹ بافی یعنی کام دار۔ بوٹ جاڑوں میں انگرکھے کی جگہ نیلے، زرد، یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی دار گلا''۔

نصیرالدین حیدر شاہِ اودھ کے متعلّق شرّر نے لکھا ہے:

> ''نصیرالدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے اور عورتوں ہی کا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی عقیدت نے یہ شان پیدا کردی کہ ائمۂ اثنا عشری کی فرضی بیبیاں (اچھوتیاں) اور اِن کی ولادت کی تقریبیں جو اُن کی ماں نے قائم کی تھیں، اِن کو اور زیادہ ترقّی دی یہاں تک کہ ولادتِ ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے، چہرے اور حرکات سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرتے اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے، جس کے لیے ولادت، چھٹی اور نہانے کے سامان بالکل اصل کی طرح کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی''۔ (گزشتہ لکھنؤ، مکتبہ جامعہ اڈیشن، ص ۹۰)

نجم الغنی خاں نے تاریخ اودھ میں دھنیا مہری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''چار پانسو عورتیں پری پیکر خوب صورت ملازمِ سلطانی ان مہریوں کی ہمراہی میں تھیں۔ ایک سے ایک حسن و جمال میں غیرتِ آفتاب و ماہتاب تھی۔ سن و سال میں کوئی پری رخسار بیس پچیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ عورتیں پُرتکلّف پوشاکوں اور زیور سے آراستہ رہتی تھیں۔ ہر وقت عطر سے معطر ہوتی تھیں۔ اکثر امرائے تماش بین اِن دل فریبوں سے شب کو پہلو گرم کرتے تھے اور لکھنؤ کے نوجوان طرح دار اِن پر مرتے تھے۔ شہر کی طرح دار رنڈیوں کا بازار ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ یہ سب عورتیں بادشاہ کی سواری کے ساتھ رہتی تھیں''۔
>
> (جلد چہارم، ص ۳۰۸)

یہ سارے کا سارا انداز اِسی ایک بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ معاشرے میں نفاست اور صلابت کے عدمِ توازن نے یک رُخا پن پیدا کردیا تھا اور تہذیب آرایشی اجزا کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔

طوائف کو اِس معاشرے میں تہذیبی نمائندگی کا شرف مل گیا تھا۔ طوائف (پوری دنیا کی طرح) دہلی میں بھی تھی؛ مگر وہاں اِس کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہوسکی جو اِس معاشرے میں حاصل تھی۔ دہلی تو پھر بھی دور تھی؛ وہ علاقے جو لکھنؤ سے قریب تر تھے اور حکومتِ لکھنؤ کے ماتحت تھے، جیسے ملیح آباد اور کاکوری؛ وہاں بھی طوائف کو وہ حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ کہیں اور اِس کو یہ حیثیت حاصل ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ حالات ہی کہیں اور کارفرما نہیں تھے جن سے لکھنؤ کی اِس خاص معاشرت کی صورت گری ہوئی تھی اور اِسے آب و رنگ ملا تھا۔

اِس معاشرے میں طوائف کی اہمیت اور حیثیت کا اِس سے بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عزاداری جیسی مذہبی چیز بھی اُن کی دسترس سے باہر نہیں رہی تھی۔ خورشید الاسلام کے الفاظ میں:

> ''عزاداری جو ایک مذہبی فریضہ تھا اور جس میں حد درجہ سنجیدگی اور متانت واجب تھی، اِس میں بھی طوائفوں نے سوزخوانی کے کمال سے فائدہ اٹھا کر دخل حاصل کرلیا تھا اور اِس طرح دنیا ہی نہیں، آخرت بھی اِن کے ہاتھ میں چلی گئی تھی''۔
>
> (تنقیدیں، طبع دوم، ص ۱۳۴، حوالہ 'حیاتِ شوق' ص ۳۰۸)

پروفیسر آل احمد سرور نے زہرِ عشق اور بہارِ عشق کی ہیروئنوں کے بارے میں ایک جگہ یہ نہایت بلیغ بات لکھی ہے کہ: ''مہ جبیں میں کم اور مہ لقا میں زیادہ ہمیں طوائف کی جھلک نظر آتی ہے'' (اس کا حوالہ آگے آرہا ہے)۔ اِس میں فریبِ عشق کی ہیروئن کو بھی شامل کرلینا چاہیے، کیوں کہ زہرِ عشق کی ہیروئن کے مقابلے میں اِس میں طوائف پن کی نمود کچھ زیادہ ہے۔ یہ دراصل معاشرے کے اُنھی اجزا کا عکس ہے جن کا کچھ ذکر ابھی آیا ہے۔ اِس تہذیب میں طوائف کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی جارہی تھی؟ اِس کے اثرات کا بکھرے ہوئے عکسوں کی صورت میں زندگی اور اس کے مظاہر میں نمایاں ہونا کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں۔ شررؔ نے گزشتہ لکھنؤ میں لکھا ہے:

> ''لکھنؤ میں شجاع الدّولہ کے زمانے میں رنڈیوں سے تعلّقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی تو روز بہ روز اِسے ترقّی ہوتی گئی۔ امیروں کی وضع میں داخل ہوگیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلّق رکھتے... ان بے اعتدالیوں کا ایک ادنا کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ میں مشہور تھا کہ جب تک انسان کو رنڈیوں کی صحبت نہ نصیب ہو، آدمی نہیں بنتا۔ آخر لوگوں کی اخلاقی حالت بگڑ گئی۔ رہے عورتوں کے اخلاق و عادات، اِس بارے میں ہمارا عام دعوا ہے کہ جن لوگوں کو زناکاری کا شوق ہو، اُن کی عورتیں پارسا نہیں ہوسکتیں''۔

نجم الغنی خاں نے تاریخِ اودھ میں نصیرالدین حیدر اور واجد علی شاہ کے محلّات کے جو حالات لکھے ہیں، اُنھیں پڑھ کر عبرت ہوتی ہے۔ جب شاہی محلّات میں کم حیثیت اور بازاری عورتوں کو بارِ عام مل سکتا تھا اور اِس صورت میں اُن عورتوں کے دوسروں سے ناجائز تعلّقات ہوسکتے تھے، تو اِس سے معاشرے کی عام حالت پر جو اثرات پڑ سکتے تھے، اِن کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ حیدری بیگم نے واجد علی شاہ سے جب یہ کہا تھا:

کہا: حمل ثابت علی خاں کا ہے　　خطا کی، خطا کام انساں کا ہے
نہیں میں فقط ایک تقصیر وار　　کہ اس دام میں اور بھی ہیں شکار

(تذکرۂ شوق، ص ۳۰۶)

تو ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا تھا جس سے بہت سے لوگ باخبر تھے۔ اِسی طرح جو نوّاب مرزا شوقؔ اپنی مثنوی فریبِ عشق میں یہ کہتے ہیں:

رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں　　بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
کُھلتا ہر اک پر اِن کا حال نہیں　　کون ہے اِن میں جو چھنال نہیں
ڈھونڈتی پھرتی خود حسین ہیں یہ　　ہم سے دونی تماش بین ہیں یہ

تو معاشرے کی ایک ایسی تلخ حقیقت کو بیان کیا تھا جس سے لوگ بے خبر نہیں تھے، لیکن اُس کو بیان کرنے کی یا تو جرأت باقی نہیں رہی تھی، یا پھر وہ معاشرے کا ایسا حصّہ بن چکی تھی کہ اجنبیت اور اعتراض کی گنجایشیں گویا ختم ہوچکی تھیں (آج کے طالبِ علم کے لیے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ شوقؔ کے پہلے شعر میں ''رنڈیاں'' عام خواتین کے معنی میں آیا ہے۔ اُس زمانے میں یہ لفظ اس معنی میں مستعمل تھا)۔ فریبِ عشق میں شوقؔ نے لکھا ہے:

وضع کی گو تھی سب کو پابندی　　پر نہ بچتی تھی کوئی نوچندی
دوست جتنے تھے، رہتے تھے ہمراہ　　کربلا میں کبھی، کبھی درگاہ
رہتا تھا تیرھویں کا جلسہ یاد　　شام سے جاتے تھے حسین آباد

مثنوی زہرِ عشق میں ہیروئن کے "ملنے کا دستور" یہ بتایا گیا ہے:

پنج شنبے کو جاتی تھی درگاہ　　واں سے آتی تھی میرے گھر وہ ماہ

مثنوی بہارِ عشق میں ہیروئن کہتی ہے:

ہم بھی درگاہ آج جائیں گے　　ہوگی فرصت تو واں بھی آئیں گے

اِس طرح ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کربلا اور درگاہِ حضرت عباس، جو عقیدت کے آستانے تھے، تماش بینی کے مرکز بن گئے تھے۔ حسین آباد کے تالاب پر تیرھویں کو جو میلا لگتا تھا وہ تفریح اور تماش بینی کا بڑا اجتماع بن کر رہ گیا تھا، جہاں نوّاب مرزا شوق کے الفاظ میں:

رات ہنس بول کر گزارتے تھے　　صبح سب اپنے گھر سدھارتے تھے

تذکرۂ شوق میں منقول مصحفی کا یہ شعر اسی صورتِ حال کی ترجمانی کرتا ہے:

نوچندی آئی دھوم سے، چل تو بھی مصحفی　　جاتی ہیں کربلا کو حسینوں کی ڈولیاں

لذّت اندوزی اور عیش کوشی معاشرے کے نمائندہ طبقے پر چھائی ہوئی تھی؛ مگر یہ کوئی حادثہ نہیں تھا، ایسی بات نہیں تھی جو اچانک واقع ہوئی ہو۔ یہ تو اُس تہذیبی زندگی کا ایک حصّہ تھا جس نے خاص حالات میں فروغ پایا تھا اور اُن حالات کا لازمی نتیجہ تھا جن کے تحت اِس معاشرے میں مذہبیت کی طاقت ور روایت اور عیش پرستی کی سطحیت، دونوں ایک مرکز پر جمع ہو گئی تھیں۔ اِس میں کسی طرح کا تضاد محسوس نہیں ہوتا تھا؛ اِس لیے کہ یہ عیش پرستی اُس تہذیب کا تقاضا تھا۔

اِن مثنویوں میں شوخ نگاری پر ہمارے بعض بزرگوں نے اعتراض کیا تھا، خاص کر بہارِ عشق کے بیانِ وصل کے کچھ اشعار پر۔ اِس سلسلے میں ایک بات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ فارسی اور اُردو، دونوں زبانوں کی متعدّد مثنویوں میں اِس انداز کی شوخ نگاری ملتی ہے، وہ مولانا جامی کی "یوسف زلیخا" ہو یا خواجہ میر اثر کی "خواب وخیال"۔ یہ روایت بھی اُردو کو فارسی سے ملی ہے کم وبیش کے تناسب کے ساتھ یہ انداز ایسی بیش تر مثنویوں میں ملتا ہے، یعنی یہ داستانی اور عشقیہ مثنوی نگاری کی روایت کا ایک حصّہ رہا ہے، سراپا کے بیان کی شکل میں یا بیانِ وصل کی صورت میں۔ یہ اعتراف کیا جانا چاہیے کہ بہارِ عشق کے کچھ اشعار میں بیان کی لطافت برقرار نہیں رہ سکی ہے، اِن میں ابتذال ہے، کھلا ہوا ابتذال ہے، لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت سے بہت ۲۴ یا ۲۵ ہوگی، اِس سے زیادہ نہیں۔ ایسی دوسری مثنویوں کے ایسے ہی اشعار کو اگر یک جا کر دیا جائے، مثلاً اُردو ہی میں میر اثر اور مومن کی مثنویوں کے ایسے اشعار کو، تو پھر شوق کا نام اِس سلسلے میں سرِ فہرست نہیں لکھا جا سکے گا، کئی سطریں نیچے لکھا جائے گا۔ جس طرح ایسے اشعار کی بنا پر یوسف زلیخا کو یا میر اثر کی خواب وخیال کو اور مومن کی مثنویوں کو نظر انداز نہیں کرتے، انھیں ادب کا قابلِ ذکر حصّہ مانتے ہیں اور ان شاعروں کو فحاشی کا مبلّغ اور بد اخلاقی پھیلانے کا مجرم قرار نہیں دیتے، اِسی طرح شوق کی مثنویوں کو بھی ادب کا حصّہ اور شوق کو اپنے معاشرے کا ترجمان مانا جائے گا۔ معاشرہ جیسا تھا، ترجمانی بھی ویسی ہی ہوگی اور تصویر بھی ویسی ہی بنے گی۔ کیا آج بڑے سے بڑا مبلّغِ اخلاق اِس کے لیے تیّار ہو سکے گا کہ گلستاں کے بابِ پنجم کی بنا پر پوری کتاب کو ناقابلِ التفات قرار دے یا اسے بد اخلاقی کا مجموعہ کہنے کی جرأت کر سکے۔ جس زمانے میں گلستاں لکھی گئی تھی یا مثنوی یوسف زلیخا لکھی گئی تھی، اُس زمانے میں آج سے زیادہ اور بڑے پایے کے مبلّغِ اخلاق موجود تھے اور کسی نے سعدی یا جامی کو فحش نگار نہیں قرار دیا تھا۔

ادبی وشعری روایت کو اور سماجی حقائق کو نظر انداز کر کے ہمیں فیصلے نہیں کرنا چاہیے۔ آج ہم میں سے کون اس کے لیے آمادہ ہو سکے گا کہ عالمی ادب کے ایسی شاہ کاروں کو دریا بُرد کر دے جن کو مذہب اور اخلاقیات کی بارگاہ سے منظوری کا پروانہ نہیں مل سکا ہے اور نہیں مل سکے گا۔ جو لوگ اِس سلسلے میں کچھ زیادہ رقیق القلب ہوں اُنھیں چاہیے کہ منٹو اور عصمت پر فحاشی کے تحت جو مقدمے چلائے گئے تھے، اُن کی روداد کو ایک بار پڑھ لیں اور اِس سلسلے میں اُس زمانے کے اساطینِ ادب نے جو بیانات دیے تھے، اُن کا مطالعہ کر لیں۔

جس طرح یہ خیال کرنا حقیقت کے خلاف ہوگا کہ ان مثنویوں میں شوق نے اپنے سرگزشت بیان کی ہے، اُسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں ہوگا کہ شوق نے یہ مثنویاں لکھنوی معاشرے کی اصلاح کے لیے لکھی تھیں (تذکرۂ شوق کے مصنف عطاءاللہ پالوی نے یہ بات خاص طور پر لکھی ہے)۔ شوق اگر زندہ ہوتے اور ان پر یہ "الزام" لگایا جاتا، تو مجھے یقین ہے کہ وہ ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ ضرور دائر کر دیتے۔ وہ اُس طبقۂ اشرافیہ کے ایک فرد تھے جو ایسے جلسوں کو اور ایسی لطف اندوزیوں اور جنسی کامیابیوں کو تہذیبی زندگی کا جز مانتا تھا۔ آج ہم اپنے زمانے میں بیٹھ کر جو بھی کہیں اور اخلاقیات کے جس سبق کو چاہیں دُہراتے رہیں، اِس معاشرے کے آداب واطوار بالکل مختلف تھے۔ اُس تہذیب میں ایسے سارے مظاہر کی حیثیت زندگی کے لازمی حسین اجزا کی تھی اور اُن سے لطف اندوز ہونا خوش ذوقی کی پہچان تھی۔ شوق اِس قدر تنگ نظر تہذیب ناآشنا اور زندگی بیزار نہیں تھے کہ اِس معاشرے میں ناصحِ ناداں اور واعظِ کم فہم بن کر اپنی بدذوقی کا اعلان کرتے۔ راہِ نجات لکھنے والے اور فریبِ عشق اور بہارِ عشق لکھنے والے دو الگ الگ راہوں کے راہی ہوتے ہیں۔ معاشرے میں گنجایش دونوں کے لیے ہوتی ہے (شاید ضرورت بھی) لیکن یہ واقعہ ہے کہ شاعر کی حیثیت واعظ سے برتر ہوتی ہے۔ معاشرے کی عکاسی شاعری میں مل سکتی ہے، پند و وعظ میں نہیں، اور اِس لحاظ سے شوق کی برتری مسلّم ہے ... کہ بعض حسین ترین اجزا کا ترجمان ہے اور اِس لحاظ سے اس کی شاعری

سچّی ہے۔ جیسا وہ معاشرہ تھا، ویسا ہی اس شاعری کو بھی ہونا چاہیے تھا اور یہ ویسی ہی ہے۔ اسے رسمی اخلاقیات کے پیمانے سے ناپنا، خوش ذوقی کی جان پر ستم ڈھانا ہے۔

شوقؔ نے یہ مثنویاں کسی بھی مقصد کے تحت لکھی ہوں اِن میں سنجیدہ نگاری اور شوخ بیانی کا جو بھی انداز ہو؛ یہ واقعہ ہے کہ یہ ایسے آئینے ہیں جن میں اُس معاشرے کے بہت سے عکس محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ عکس بہت شوخ رنگ ہیں، لیکن حقیقت کے عکّاس ہیں۔ آپ اِن مثنویوں کو اُس عہد کی تہذیبی زندگی کے بعض مظاہر کے آنکھوں دیکھے بیانات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِن مثنویوں کی یہ اہمیّت آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی۔ اس اعتبار سے اِس عہد کی تہذیبی تاریخ کے طالبِ علم کے لیے اِن کا مطالعہ ناگزیر قرار پائے گا۔

دبستانِ لکھنؤ کی ادبی اور لسانی جہات کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے بھی اِن مثنویوں کی اہمیّت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ عہدِ ناسخؔ کی شعری روایت اور تلامذۂ ناسخؔ کے قواعدِ شاعری سے متعلّق بیانات کا جو لوگ جائزہ لینا چاہیں گے، یہ مثنویاں اُن کے مطالعے کا لازمی جز رہیں گی۔ یہ ایک طرف تو لسانی سطح پر عہدِ ناسخؔ میں زبانِ لکھنؤ پر دہلی اثرات کی نشان دہی کرتی ہیں اور دوسری طرف ناسخؔ اور تلامذۂ آتشؔ و ناسخؔ کے شعری اسالیب کے مقابلے میں ایک متوازی شعری اسلوب کی آئینہ دار ہیں۔ یہی نہیں، ''زبانِ محلات'' کی ایسی اور اتنی روشن اور دل کش مثالیں اِن مثنویوں میں یک جا ہو گئی ہیں کہ اِن کو پڑھ کر زبانِ لکھنؤ کی لطافت اور نفاست کی پوری روایت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اِن مثنویوں کو الگ رکھ دیجیے تو پھر نفیس زبان اور لطیف اندازِ بیان کا ذخیرہ کچھ کم معلوم ہوگا، ناتمام اور کم رنگ نظر آئے گا۔ زبانِ لکھنؤ کے جس لوچ، نرمی اور ریشمی پن کی تعریف کی جاتی ہے، وہ ناسخؔ اور اُن کے متّبعین کے یہاں نہیں ملے گا۔ وہ تو نوّاب مرزا شوقؔ کی مثنویوں میں محفوظ ہے (یا پھر ایک دوسری سطح پر میر انیسؔ کے مرثیوں میں)۔ بہ قولِ مولانا عبدالماجد دریابادی:

> ''محاورات پر یہ عبور، بیگمات کے روزمرّہ پر یہ قدرت، زبان کی یہ صحّت، بیان کی یہ سلاست، جذبات نگاری کی یہ قوت کیا ہر شاعر کے نصیب میں آتی ہے؟''۔

[ماہنامہ ''ایوانِ اُردو'' نئی دہلی، ص ۵ تا ۱۱، اپریل ۱۹۹۸ء]

رشید حسن خاں، ۱۶۷- باروزئی II، شاہ جہاں پور-۲۴۲۰۰۱ (یوپی)

☆☆☆

ضمیمہ(3)

رشید حسن خاں کا خط نیر مسعود کے نام

''دیکھیے بھائی! میرا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ آپ کے دل کو تکلیف پہنچی۔ مجھے اگر ذرا بھی احتمال ہوتا تو یہ تحریر ہی وجود میں نہیں آتی۔ میں اپنے مخلصین کے دل کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا ہوں۔ میں یہ مانتا ہوں کہ مجھے احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ اب مزید غیر مناسب باتیں ہوں اور بحث بڑھے، یہ کسی طرح مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے دہلی (انجمن ترقی اُردو (ہند) کو) ابھی خط لکھا ہے۔ میں جون میں وہاں جاؤں گا اور اُس حصے کو از سرِ نو لکھوں گا، تاکہ شکایت کا کوئی پہلو نہ رہے اور احتیاط کے تقاضوں کی پاس داری بھی ہو جائے۔ آپ کے خط سے یہ بڑا فائدہ ہوا اور اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ بروقت بات سامنے آ گئی اور بآسانی اُسے بنایا جا سکتا ہے... آپ اپنے احباب سے اِس خط کے حوالے سے یہ باتیں کہہ سکتے ہیں، البتہ یہ خط صرف آپ کے لیے ہے۔ اب آپ اِس پر غور کر لیجیے کہ جب اس تحریر کو از سرِ نو لکھا ہی جانا ہے تو کیا یہ مناسب ہوگا کہ خواہ مخواہ بات بڑھے اور یار لوگ لطف لیں... اِس بنا پر کیا مناسب نہ ہوگا کہ اب وہ خط نہ چھپے۔ اس کا لہجہ بھی خاصا غیر مناسب ہے۔''

(سہ ماہی اُردو ادب، جنوری تا مارچ 2007، صفحہ 235، محررہ 2 مئی 1998 بنام نیر مسعود)

خاں صاحب کا خط ملتے ہی نیّر مسعود نے ''ایوانِ اُردو'' کو خط لکھا کہ خاں صاحب کے خلاف ان کا مراسلہ شائع نہ کیا جائے۔ اِس بابت مخمور سعیدی مرحوم (م 2010) لکھتے ہیں:

''جب آپ (نیّر مسعود) کے دو خط (تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد) یکے بعد دیگرے اُس کی اشاعت روک دینے کے بارے میں موصول ہوئے، اس وقت تک جولائی کا شمارہ چھپ کر تیار ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہ تھا کہ آپ کا خط اس میں حذف کر دیا جائے۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، اگست 1998، صفحہ 57)

☆☆☆

ضمیمہ(4)

عبدالحق

مثنویاتِ شوق

شعبہ کے سابق رفیق کار اور اُردو کے معروف محقق جناب رشید حسن خاں نے مرزا شوق کی مثنویوں پر مضمون لکھا اور طعنے پڑ رہے ہیں پروفیسر نیّر مسعود پر؟ کیوں کہ دونوں میں دوستی ہے۔ پتا نہیں اس دوستی کی بنیاد ذاتی تھی یا علمی وادبی۔ یہ اگر علمی بنیاد پر قائم ہوتی تو جناب نیّر مسعود اپنے منصب اور مقام سے فروتر لہجہ اختیار نہ کرتے۔ شاید ان پر پڑنے والے طعن وتشنیع خاں صاحب کی طرف لوٹا دیے گئے ہیں۔ حیرت ہے کہ دوسروں کے کہنے سننے یا لعن طعن کے ردِّ عمل میں یہ مضمون لکھا گیا۔

حریم میرا خودی غیر کی معاذ اللہ

مجھے نہ خاں صاحب سے غرض ہے اور نہ نیّر مسعود صاحب سے کچھ لینا دینا ہے۔ میرے لیے دونوں محترم ہیں اور میں دونوں کی علمی خدمات کا معترف ہوں۔ مگر علمی مباحث میں پُر وقار سنجیدگی اور مہذب لہجے کی توقع کرتا ہوں۔ خاں صاحب محققِ اعظم نہ سہی محقق تو ہیں ہی اور انھیں نیّر مسعود صاحب پر بزرگی میں بھی سبقت اور فضیلت حاصل ہے، پاسِ احترام رکھنا چاہیے۔ شاید انحطاط آمادہ معاشرے میں دانشوروں کے اظہار اور اسالیب کے معیار بھی بدل جاتے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں علی گڑھ کے بُزرگ اساتذہ کے درمیان غیر شائستہ مکالمہ زبان و دہن دونوں کے بگڑنے اور بدنمائی کا مظہر بنا رہا۔ زوال زدگی میں قومی ضمیر اور اندازِ فکر کا بدل جانا قرینِ قیاس ہے۔ ثقافت کی مجہول تعبیر اور منفی پہلوؤں پر زور (غیر شعوری طور پر) دانش وبنیش کے مسلمات سمجھے جاتے ہیں۔ ان سے عام گم رہی پھیلتی ہے اور تہذیبی اقدار مذموم قرار پاتے ہیں۔ دہلی ہو کہ لکھنؤ یہ سواد اعظم کی عظیم اور مقتدر ثقافت ہے۔ اس وراثت کو بدنام کرنے کی شعوری کوشش برطانی عہد سے آج تک جاری ہے۔ تخلیق کاروں نے ابتدا کی۔ مورّخوں نے نقادوں نے عیب جوئی میں سبقت لی۔ فلموں کے علاوہ چند سیریل کے نام لے سکتا ہوں جن میں شراب وشاہد سے اس تہذیب کو مختص کیا گیا ہے۔ مرزا غالبؔ جانِ عالم، کہکشاں زندہ مثالیں ہیں۔ حیرت ہے کہ سردار جعفری جیسے بزرگوں کا قلم بھی اس سیاہی میں آلودہ ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی تاریخ میں لکھنؤ دبستان ادب کو عقیدہ اور نازونخرہ سے تعبیر کیا ہے۔

مثنویاتِ شوق کے سیاق میں خاں صاحب کا استشہاد جزوی طور پر قابلِ تسلیم ہوسکتا ہے۔ مگر اس کی کلیت کا اعتراف ممکن نہیں۔ دبستانوی تنقید نے ادبی تفہیم میں جو فساد پیدا کیا ہے اس کی مثال یہ مضمون بھی ہے۔ تخلیقی فعالیت کے سرچشمے جداگانہ ہوتے ہیں اور بے حد پُراسرار۔ تخلیق نہ عصری میلان کے ماتحت ہوتی ہے اور نہ معاشرت کا بے کم وکاست اظہار۔ نتائج کا استخراج کا یہ طریقۂ کار غلط بھی ہے اور گم راہ کُن بھی۔ کیا جوش کی تحریروں کے پس منظر میں پورے معاشرے کو بوالہواس کہنا مناسب ہوگا؟ کیا درد کے صوفیانہ تصورات سے دہلی معاشرت کو سرتاپا تکشف میں مستغرق قرار دیا جاسکتا ہے۔ خواجہ حافظ اور ریاضی کی خمریات سے کیا نتیجہ اُخذ کیا جائے گا؟ اسی طرح مثنویات ہوں یا مرثیے، غزل ہو یا دوسرے اصناف ان کی تخلیق کو مخصوص معاشرے کا زائیدہ کہہ کر ہم انتقاد کی ذمہ داریوں سے سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ طوائفیں معاشرے کے مزاج میں ہمیشہ داخل رہیں، جسے ہمیشہ معیوب سمجھا گیا اور معتوب بھی کیا گیا۔ ہاں رجحان کے بیش وکم پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

جناب نیّر مسعود نے خاں صاحب سے مناسب مطالعہ کیا ہے کہ تہذیبی مطالعہ کے تقاضے ذرا مختلف ہیں مگر جناب نیّر مسعود نے جارحیت میں خاں صاحب کی علمیت کو ابجد سے ناواقفیت قرار دیا ہے۔ ثقافتی مطالعے میں خود نیّر صاحب کی حرف شناسی بھی مشتبہ ہے۔ جب کہ مضمون کے پہلے پیراگراف میں انھوں نے خاں صاحب کو عہد حاضر کے سب سے بڑے محققوں میں شمار کیا ہے۔ اب رہا سوال مآخذ اور حوالوں کا جس پر مضمون نگار نے بڑا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ان کے مزکورہ مآخذ بھی شافی وکافی نہیں ہے، جسے آپ خاں صاحب کے منابع سے منحرف نظر آتے ہیں۔ علمی دیانت داری میں ہر قسم کی ادعائیت اور عصبیت ناپسندیدہ ہے۔ اور یہ بحث بھی سعی لاحاصل ہے۔

یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے کہ مصنف کی آرا اور ایما سے مطابقت رکھنے والے منابع ہی مستند ہوں باقی مسترد کیے جانے کے لائق۔ جناب نیّر مسعود نے خاں صاحب کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تحقیق کی بنیاد پہلے سے ہی طے شدہ شبہات پر ہوگی تو سچائی تک رسائی مشکل ہوجائے گی۔ تحقیق کی اساس تلاش حق اور سچائی تک رسائی

پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر خورشید الاسلام کی کاوشوں سے استناد کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا ہے کیوں کہ وہ محقق نہیں ہیں صرف نقاد ہیں۔ مگر ہیں دیانت دار۔ یہ بد مذاقی بھی خوب ہے کہ محقق مستند ہوتا ہے مگر دیانت نقاد حوالے کا موجب نہیں بن سکتا۔ حقیقت حال یہ کہ آج ادبی مطالعے میں سرور صاحب یا خورشید الاسلام صاحب جس کثرت سے نقل کیے جاتے ہیں وہ شرف نہ خاں صاحب کو ملا ہے اور نہ ہی نیّر مسعود صاحب کو حاصل ہے۔ ان کے کثرتِ مطالعہ اور وسعتِ نظر میں یہ حضرات پیچھے ہیں۔ نیّر صاحب لکھنوی معاشرت کے پروردہ سہی مگر ان کا ایک بھی مضمون خورشید صاحب کے امراو جان ادا کا حریف نہ بن سکا۔ شبلی کا بہ وجہ ذکر نہیں کرتا۔ پروفیسر محمد مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم کی خدمات کو لیجیے ان کی محققانہ حیثیت جو بھی ہو مگر ''ہماری شاعری'' اور تمثیل ادب پر ان کی تصانیف کو کتابِ حوالہ کا درجہ حاصل ہے جو یقیناً تحقیق محض نہیں ہیں۔ تخصیص یا تعین کوتاہ بینی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ خود نیّر مسعود صاحب افسانہ لکھتے ہیں۔ کیا افسانہ نگار ہونے کی وجہ سے ان کی تحقیقات کو بے اعتبار کہنا مناسب ہوگا؟ رہا مذہبی امور کا معاملہ، ان نازک اور نزاعی مسائل میں دونوں حضرات کو دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے دور رہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ادب کی مذہبی یا مذہب کی ادبی تعبیر زیادہ مفید نہیں ہوسکتی۔ بل کہ ذہنی اختلاف کا زیادہ احتمال ہوگا۔

خاں صاحب نے شوق کے ساتھ ساتھ میر اثر اور مومن کی مثنویوں کو بھی معاشرت کے آئینہ داری کے لیے تمثال قرار دیا ہے۔ ان مثنوی نگاروں کے ذاتی اور انفرادی تخیلات کو معاشرت پر منطبق کرنے کا رویہ مستحسن نہیں ہے۔ مومن پر گفتگو کرتے وقت ان کی مثنوی جہاد کو بہ سہولت نظرانداز کر دیا جاتا ہے حالاں کہ اُردو میں ایک مقتدر شاعر کی یہ پہلی انقلابی نظم ہے۔ شاید اس باعث وہ ''آبِ حیات'' میں نظرانداز کیے گئے تھے۔ آخری حصے میں مضمون کے محرکات پر کالے اور سفید آقاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کہ خاں صاحب نے کن آقاؤں کی خوش نودی کے لیے یہ مضمون لکھا۔ لیکن جناب نیّر مسعود نے اقرار کیا ہے کہ انھوں نے کچھ اپنے سرپرستوں کی تسکینِ نفس کے لیے ردِّعمل کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ کم و بیش بہت سی باتوں کا ذکر اس سے پہلے خاں صاحب انتخابِ ناسخ اور انتخابِ مراثی کے مقدموں میں کر چکے ہیں مگر ان پر کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔ دہلی میں یہ افواہ گرم ہے کہ خاں صاحب کو یوپی اُردو اکیڈمی کا اعزاز پیش کیے جانے پر بعض حلقے رنجیدہ ہیں۔

میرا معروضہ بس اتنا ہے کہ ہم ثقافت کے روشن اور حیات بخش پہلوؤں کو عزم و ارادہ کا لافانی جذبہ متحرک کرتا ہے یہ دہلی یا لکھنؤ پر موقوف نہیں۔ سوادِ عظم کا سبھی قریہ عظیم و لازوال تہذیبی آثار سے تاب ناک ہے۔ ان کی باز آفرینی ہمارے اجتماعی مقاصد میں نکتۂ پرکار حق کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے حصول کے لیے قیل و قال کی یہ آویزش ممنوع ہے اور مہلک بھی۔

(**نوٹ**۔ مضمون نگار شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر کی عہدے پر رہ چکے ہیں)

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، ستمبر 1998، ص 14 تا 15)

(تبریک و تبصرے، پروفیسر عبدالحق، اشاعت 2012، صفحہ 150 تا 153)

☆☆☆

ضمیمہ (5)

لطیف صدیقی

مثنویاتِ شوق: ''لکھنوی معاشرت کے آئینے''

رشید حسن خاں صاحب کا مضمون ''مثنویاتِ شوق، لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' (ایوانِ اُردو، اپریل 1998) میں پڑھا تھا اور اب ڈاکٹر نیّر مسعود صاحب کا

خط''بہ نام رشید حسن خاں''(ایوانِ اُردو، جولائی 1998) نظر نواز ہوا۔

ڈاکٹر نیّر مسعود نے شرر اور نجم الغنی کے شواہد کو منفی قرار دیا ہے۔ یہ انھوں نے کس بنیاد پر کیا ہے اور منفی شواہد قرار دینے کا پیمانہ کیا ہے یہ واضح کرنے میں پروفیسر نیّر قاصر ہیں:

> ''قدیم لکھنؤ کی آخری بہار'' مرتب مرزا جعفر حسین صاحب کی تصنیف ہے۔اس کتاب کے مقدمے میں مرزا صاحب نے تحریر کیا ہے''میں نے بہرحال سماجی قیاسی واقعات پیش کرنے سے اجتناب کیا ہے البتہ بعض پُرانے واقعات ضمناً پیش کر دینا بھی ناگزیر تھا اس لیے ان کو معتبر روایات سے اخذ کر لیا۔خدا کرے میری یہ کاوش اربابِ ذوق کو آسودگی فراہم کر سکے۔آمین!''

560 صفحات کی کتاب (قدیم لکھنؤ کی آخری بہار) میں پانچواں باب طوائف بازی پر ہے۔یہ باب 125/صفحات پر مشتمل ہے۔اس باب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں زنانِ خانگی، دوسرے حصے میں زنانِ بازاری اور تیسرے حصے میں ڈیرے دار طوائفوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔فرنگی محل، ندوۃ العلما، خان دان اجتہاد اور سلطان المدارس کو صرف 13/صفحات میں ہی نپٹا دیا گیا ہے۔اس سے یہ اندازہ تو کیا جا سکتا ہے کہ قدیم لکھنؤ کی تہذیب میں اہم کیا تھا اور غیر اہم کیا تھا؟ مرزا صاحب کے الفاظ میں:

> ''زنانِ خانگی کے بارے میں یہ روایت مشہور تھی کہ اس صنف کا کوئی وجود لکھنؤ کے باہر نہیں تھا۔غدر کی تباہ کاریوں نے خواص اور عوام کے ہزار ہا گھر تباہ اور برباد کر دیے تھے اور بہت سے شرفا نانِ شبینہ کو محتاج تھے۔انھیں خانماں برباد لوگوں کے گھروں میں بہت سی عورتوں کو بھوک کی مصیبت سے تنگ ہو کر جسم فروشی پر آمادہ ہونا پڑا تھا۔۔بعض شوخ چشم اور تیز مزاج مستورات پردے کے باہر نکل کر چھجّوں اور کوٹھوں پر آ بیٹھیں تھیں۔لیکن بہت سی ایسی بھی تھیں جو بےنقاب ہونے کی جسارت نہ کر سکیں اور اندرونِ خانہ کسب کر کے اپنے خان دان کو روٹی فراہم کرتی تھیں۔لیکن یہ کاروبار صیغۂ راز میں نہیں چل سکا۔رفتہ رفتہ ان زنان خانگی کے ناموں کی شہرت بھی ہونے لگی ،طبقاتی نظام کے دور میں ان کو بہت جلد ایک صنف کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ان کے لیے''خانگیوں'' کی اصلاح معرضِ وجود میں آ گئی ،لکھنؤ کی معاشرت میں اس وقت ان کا ایک مقام تھا۔'' مرزا صاحب آگے لکھتے ہیں''.....یہ ٹھکانے صرف ایسے من چلے شریف نوجوانوں کے کام آتے تھے جن کے پاس اپنے نفسیاتی جوش کو ٹھنڈا کرنے کے لیے خود گھروں میں علیحدہ جگہ نہیں ہوتی تھی۔''

زنان بازاری کے سلسلے میں مرزا صاحب یوں رقم طراز ہیں۔

> ''دوسرے مقامات کے مقابلے میں لکھنؤ کی زنان بازاری کی بہرحال یہ امتیازی شان تھی کہ وہ یہاں کی معاشرت سے متاثر ہو کر شائستگی اور شگفتگی سے آراستہ اور زبان و بیان کی خوبیوں سے پیراستہ ہو گئی تھیں اور جو کسی نہ کسی سبب سے ان طریقوں کو قبول نہ کر سکیں وہ متبذل قرار پا کر شرفا و عوام کی نگاہوں میں ناقابل توجہ رہیں اور ان میں پست اور بلند کی تفریق واضح طور پر ہو گئی تھی جس میں حُسن و جمال کے معیار کو بھی کوئی جگہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلند درجہ والی رنڈیاں کہلاتی تھیں.....نئی ملاقات میں زیادہ دیر ٹھہرنے اور گفتگو کرنے کا کوئی محل ہی نہیں ہوتا تھا اس لیے یا تو تعارف حاصل کر کے آنے والا رُخصت ہو جاتا یا پھر اگر رغبت میں شدت ہوتی شب باشی کے معاملات پر افہام اور تفہیم کی باری آ جاتی تھی۔معاملہ طے ہو جاتا تو آنے والا وقتی طور سے حقوق ملکیت استعمال کرنے کا مجاز ہو جاتا تھا۔''

ڈیرے دار طوائفوں کے بارے میں مرزا صاحب کی فراہم کردہ معلومات یہ ہیں:

> ''ڈیرے دار طوائفیں اپنی صلاحیتوں کے سبب سے اور اپنے اطوار اور کردار کی بدولت مرتبت کی مالک تھیں...زینت محفل ہر طوائف تھی۔آداب و شائستگی اور تہذیب و اخلاق سے ہر ایک مزین تھی۔رؤسا و عمائدین کے درباروں میں ان کو رسوخ حاصل تھا اور بعض مقتدر ترین طوائفوں کو رؤسا کی محل سراؤں میں داخل ہو کر بیگمات کے حضور حاضر ہونے کی اجازت تھی۔جنسی تعلقات میں ضرورت سے زیادہ محتاط تھیں۔''

مرزا صاحب کی رائے میں طوائفوں کے گھر تہذیب کی درس گاہ تھیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''رؤسا و شرفا حسن اخلاق کی تعلیم کے لیے اپنے بچوں کو ان طوائفوں کے گھروں میں بھیجا کرتے تھے۔ چودھرائن کا محل شرفا رؤسا کے لڑکوں کے لیے اچھا خاصا مکتب تھا......دوسری طرف انھوں نے اپنی ہنرمندانہ صلاحیتوں اور اپنے فن کارانہ سلیقوں سے نہ صرف اپنے پرستاروں بل کہ معاشرے کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔انھیں طوائفوں کی صحبتوں میں ادیبوں اور شاعروں کو نازک خیالیاں آتی تھیں۔معدودے چند متقی اور متشرع شاعروں کے..... باقی تمام موزوں طبع حضرات نیز بلند پایہ شعرا کسی نہ کسی ڈیرہ دار طوائف سے دوستانہ روابط رکھتے تھے۔''

حکیم منّے خاں آغا فاضل کے حوالے سے مرزا صاحب لکھتے ہیں:

کے بھی شکرگزار ہیں جن کے چھوڑے ہوئے اثرات کی بدولت ہمارے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات بھی نہیں ہوئے۔''

مرزا صاحب کے مطابق شہر میں فرقہ وارانہ فسادات نہ ہونا طوائفوں کے اثرات کی وجہ سے ہے لیکن John Premble نے The Raj,The Indian Mutiny And The Kingdom Of Oudh میں لکھا ہے۔

"IN 1828 THEREWAS PARTICULARY SERIOUS CONFLICT BETWEEN MEMBERS OF THE WOUNDED,AND AS A RESULTTHE RIVAL SECTS.SIX PEOPLE WERE KILED AND NINE KING(NASIRUDDIN HAIDER)ORDER THE HOUSES OF THE OFFENDING SUNNIST TO BE PLUNDERED AND DE-STROYED."

نیّر صاحب مولانا عبدالحلیم شرر سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہیں لیکن اس عاشقِ لکھنؤ کو مرزا جعفر حسین نے عقیدت کا خراج ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔

''خداوندِ عالم جزائے خیر دے مولانا عبدالحلیم شرر کو جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت ان کی گراں قدر تصنیف 'گذشتہ لکھنؤ' میں ہم کو اپنے اسلاف کی معاشرت کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہو جاتے ہیں۔''

مرزا صاحب نے منفی شواہد کی نشان دہی نہیں کی ہے۔1975 میں ELEK BOOK LTD نے گذشتہ لکھنؤ کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ترجمہ مسٹر ہارکورٹ اور مسٹر فاخر حسین نے کیا ہے۔اس کا سستا اڈیشن 1989 میں آکسفورڈ انڈیا نے شائع کیا ہے۔مسٹر فاخر حسین لکھنوی ہیں۔مترجمین کی رائے میں۔

"THE WORK (LUCKNOW,THE LAST PHASE OF AN ORIENTAL CULTURE)HAS BEEN RECOGNISED BY ANDO-ISLAMIC SCHOLARS AS A PRIMARY COURCE OF GREAT VALUE,A UNIQUE DOCUMENT,BOTH ALIVE AND AUTHENTIC IN EVERY DETAIL OF IN IMPORTANT INDIAN CULTURE A ITS ZENITH."

رشید حسن خاں صاحب نے اس کتاب (گذشتہ لکھنؤ) سے جو حوالے دیے ہیں وہ ڈاکٹر نیّر مسعود کی نظر میں منفی شواہد ہیں۔لیکن انگریزی زبان کے مترجمین نے اس کتاب میں منفی شواہد کی نشان دہی نہیں کی ہے۔رشید حسن خاں کے نام ڈاکٹر نیّر مسعود کا خط صالح تحریر نہ ہو کر ان طعنوں کا نتیجہ ہے جو ان پر پڑ رہے تھے۔غالباً طعنے دینے والوں میں خود اتنی جرأت نہیں ہے کہ وہ کھل کر سامنے آتے۔یہ حلقہ تو اس وقت سے خاں صاحب کے خلاف محاذ آرائی کر رہا ہے جب سے ان کو اُردو خدمت کے صلے میں اُتّر پردیش اُردو اکادمی کا بڑا انعام ملا ہے۔

لکھنؤ میں مردوں کے بھی جسم فروشی کے اڈّے تھے۔ہماری تہذیب کا یہ تاریک پہلو ہے۔جان پمبل کے مطابق:

"THE EXISTENCE OF MALE BROTHELS IS CONFOMED BY THE LUCKNOW HOSPITAL REPORT FOR 1848-49 WICH NOTICES THE CASES OF VENERAL DISASE PROCEEDING;AS-DR LECKIE DELICATELY PUT IT FROM OTHER THAN THE IRREGULATIES OF FEMALE PROSTITUION KHESE PRACTICES HAD BEEN MADE FASHION ABLE BY THE NAWAB ASAF -UD-DAULA,A NOTORIOUS CATAMITE-"(THE RAJ,THE MNTINY AND THE KINGDOM OF OUDH,1801-1859)

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو دہلی ستمبر 1998 صفحہ 16 تا 17)

☆☆☆

ضمیمہ(6)

نیّر مسعود کا خط رشید حسن خاں کے نام

نـــــوٹ :ایوانِ اُردو، جولائی1998 میں اس مضمون ’بہ نام رشید حسن خاں، لکھنوی معاشرت کے آئینے‘ کے شائع ہونے سے پہلے پروفیسر نیّر مسعود نے ایوانِ اُردو کے مدیر مخمور سعیدی کے نام خطوط ارسال کیے تھے۔تا کہ خاں صاحب کے نام لکھا گیا خط نما مضمون شائع نہ ہو۔البتہ مضمون شائع ہوا۔ پروفیسر نیّر مسعود نے رشید حسن خاں کے نام ایک معذرتی خط 29 جون 1998 کوتحریر کیا تا کہ اس ادبی طوفان کوروکا جاسکے۔خط ملاحظہ فرمائیں:

’’بسم
نیّر مسعود
ادبستان، دین دیان روڈ لکھنؤ 2266003
29 جون 1998

برادرم خاں صاحب آداب
کچھ دیر قبل ’’ایوانِ اُردو کا جولائی کا شمارہ ملا تو دیکھتا ہوں اس میں میرا خط موجود ہے۔ یہ مخمور صاحب کے نام میرے مسلسل دو خطوں میں تاکیدی ممانعت کے باوجود ہوا ہے۔ میں نے ابھی ابھی ان کو احتجاجی خط لکھا ہے اور دریافت کیا ہے کہ صحافتی آداب کی یہ خلاف ورزی کیوں کی گئی ہے۔ دیکھیے کیا جواب آتا ہے مجھے آپ کا یہ اندیشہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں دہلی کی ادبی سیاست درآئی ہے۔ بہر حال آپ سے شرمندہ ہوں۔
معلوم نہیں آپ کا بمبئی والا پروگرام کس حد تک عملی ہوا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو پا رہا ہے کہ یوپی اُردو اکادمی کی انعامی تقریب کا کیا بنا۔البتہ وزیر اعظم کے عن قریب لکھنؤ آنے کی خبر ہے۔ ممکن ہے تقریب اسی موقع پر رکھی جائے
در دِ سر نے سخت پریشان کر رکھا ہے۔ خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔
ثمرہ صائمہ آداب لکھوا رہی ہیں۔ صائمہ انٹر کے امتحان میں سکنڈ ڈویژن میں پاس ہو گئی ہے۔

آپ کا
نیّر مسعود‘‘

(پروفیسر نیّر مسعود کا مضمون بہ نام رشید حسن خاں شائع ہونے کے بعد ایوانِ اُردو دہلی کے ستمبر اور اکتوبر 1998 کے شماروں میں کئی خطوط اس مضمون کے متعلق شائع ہوئے۔ جن میں کئی نئے سوال بھی قائم ہوئے۔ یہ خطوط اگلے صفحات پر حسبِ ذیل ہیں۔)

سہیل احمد اُنّاؤ

''اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی جس غلط بیانی کی گرفت پروفیسر نیّر مسعود نے کی تھی، کیا وہ غلط تھی؟ تحقیق کا اصل مقصد تو سچ کی تلاش ہے۔ اگر نیّر مسعود صاحب کے ارشادات صحیح تھے تو ان کو کتمانِ حق کی کیا ضرورت پیش پیش آ گئی۔

مروت، رواداری، دوستی اپنہ جگہ، لیکن ادبی تحقیق میں اگر اپنے پیش رووں اور بزرگوں کی غلطی ہائے مضامین کی گرفت کرنی پڑی تو کی جانی چاہیے اور کی جاتی ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے اگر علامہ شبلی نعمانی کی مایہ ناز تالیف شعرالعجم کے بہت سے بیانات کی گرفت کی تھی یا نہیں؟ خود رشید حسن خاں کی گرفت کی زد میں اگر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی تاریخِ ادب اُردو کا پروجیکٹ ختم ہوا یا نہیں؟ پھر نیّر مسعود صاحب کو یہ اعتذار پیش کرنے کی کیا ضرورت پیدا ہو گئی۔ جو کچھ انھوں نے لکھا تھا اگر وہ صحیح تھا تو اس کو نہ چھاپنے کے لیے آپ کو کیوں تاکید کی اور اگر وہ سب کچھ غلط تھا تو پھر یہ کھلا خط ''بہ نام رشید حسن خاں''انھوں نے لکھا ہی کیوں؟ رشید حسن حسن خاں بھی آخر انسان ہیں۔ ان سے بھی غلطی سرزد ہو سکتی ہے۔ لکھنوی معاشرت کے سلسلے میں ان کا بیان ایک طرفہ یک طرفہ اور تحقیق کے اصول کے منافی تھا تو پھر ان کی غلطیوں کی نشان دہی ڈاکٹر نیّر مسعود نے کوئی بے جا کام نہیں کیا تھا جس پر ان کو شرمندگی ہوتی لیکن ایوانِ اُردو کے اگست کے شمارے میں اپنا خط چھپوا کر ڈاکٹر نیّر مسعود نے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ اُردو ادب کے ایک ادنیٰ قاری کی حیثیت سے میں ڈاکٹر نیّر مسعود کے رویے کی تحسین نہیں کر سکتا بل کہ میں اسے کتمانِ حق سے تعبیر کرتا ہوں۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی ستمبر 1998، صفحہ 58)

ڈاکٹر شمس بدایونی، بریلی

''ایوانِ اُردو'' کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیّر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا۔ نیّر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سنبب میرے دل میں بڑا احترام ہے لیکن ان کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا۔ ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے۔ اس کا نمونہ نیّر صاحب کے تبصرہ فسانۂ عجائب/ مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ کتاب نما دہلی میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے اس کا یہ دوسرا نمونہ ہے ایک ہی قلم سے بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا۔ بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے۔ میری مودبانہ گزارش ہے کہ نیّر صاحب نے اگر اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے، تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں اگر اس علم و فضل کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب و احترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے۔''

(ماہ نامہ، ایوانِ اُردو، دہلی، ستمبر 1998، صفحہ 58)

اختر شاہ جہاں پوری

''ایوانِ اُردو کا شمار معیاری رسائل میں ہوتا ہے۔ یہ ادبی لوگوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ تازہ شمارہ (جولائی) اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ سبھی مشمولات قابلِ مطالعہ ہیں۔ لیکن نیّر مسعود صاحب کا خط 'بہ نام رشید حسن خاں' پڑھ کر ایسا معلوم ہوا کہ یہ خط کسی خاص جذبے سے مغلوب ہو کر تحریر کیا گیا ہے اس کے لیے اس میں علمی بحث سے کوئی واسطہ نہیں رکھا گیا ہے۔ نیّر مسعود صاحب لکھنؤ کی چند مشاہیر ہستیوں میں سرِ فہرست ہیں۔ میں ان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی یہ تحریر کم مرتبہ ہے۔ ایک تو اس میں بیان کا تضاد بھی موجود ہے دوسرے رشید حسن خاں کی کسی بات کو وہ دلیل دے کر رد نہیں کر سکے۔ بیان کے تضاد کی ایک مثال ملاحظہ ہو، کہتے ہیں ''آپ نے گذشتہ لکھنؤ بھی پوری طرح نہیں پڑھی'' جب کہ نیّر صاحب نے رشید

کیا ہی اچھا ہوتا کہ نیّر مسعود صاحب رشید حسن خاں کے دلائل اور ماخوذات کا رد دلائل اور ماخوذات سے ہی کرتے۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ کسی جذبے کے تحت ایسا نہیں کر سکے بل کہ ستم یہ ہے کہ وہ ایک بلند پایہ محقق کی تذلیل پر اُتر آئے ہیں۔ میں انھیں ایک بات بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ رشید حسن خاں کبھی غیر علمی مباحث میں حصہ نہیں لیتے۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، ستمبر 1998، صفحہ 58)

☆☆☆

ساجد رشید، ممبئی

''جناب رشید حسن خاں کے مضمون ''مثنویاتِ شوق لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' پڑھ کر میری طبعیت بھی مکدور ہوئی تھی اور جناب نیّر مسعود کا اس مضمون کے تعلق سے ایک مفصل خط پڑھ کر جی خوش ہوا تھا کہ انھوں نے اہلِ لکھنؤ کی جانب سے رشید حسن خاں صاحب کی غلط بیانیوں پر خوب پکڑ کی۔ لیکن اگست کے ''ایوانِ اُردو'' میں نیّر مسعود صاحب کا خط پڑھ کر بے حد افسوس ہوا۔ نیّر مسعود صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے رشید حسن خاں سے گفتگو کے بعد مدیر ایوانِ اُردو کو ان کا مذکورہ طویل خط شائع نہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ واہ بھئی! نیّر مسعود صاحب یہ بھی خوب رہی کہ رشید حسن خاں نے

آپ کو ذاتی طور پر کچھ سمجھایا، آپ نے انھیں قائل کیا اس سے ادب کے اس قاری کی کیا دل چسپی ہو سکتی ہے جس نے خاں صاحب کے مضمون کو پڑھ کر صحیح یا غلط رائے مضمون اور مضمون نگار کے تعلق سے قائم کر لی تھی۔ میرے خیال میں پکی روشنائی میں چھپی ہوئی تخلیق ادب کی تاریخ میں درج ہو جاتی ہے۔ اب اگر نیّر مسعود صاحب نے یہ محسوس کیا تھا کہ خاں صاحب نے اپنے مضمون میں غلطیاں کی ہیں یا تعصب سے کام لیا ہے تو انھوں نے اس کا جواب دے کر ادب کی تاریخ میں درج ہونے والی ایک غلطی کو درست کر دیا تھا۔ لیکن خاں صاحب سے گفتگو کے بعد اپنے خط کو واپس لینے سے ہم کیا مطلب اخذ کریں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ نیّر مسعود صاحب خاں صاحب کے مضمون کی غلط بیانی سے HURT ہوئے تھے یا ان کی ''علمی انا'' زخمی ہوئی تھی لیکن جب خاں صاحب نے ان سے تنہائی میں معذرت کر لی تو انھوں نے اپنا موقف بدل دیا۔ ایسے ہی ذاتی تعلقات نے اُردو ادب میں بہت ساری بُرائیاں بدعتیں پیدا کر دی ہیں۔

یہاں یہ امر ملحوظ رکھے گا کہ خاں صاحب نے آپ کے کسی ذاتی نظریے یا عقیدت سے بحث نہیں کی تھی انھوں نے ایک تحقیقی مضمون میں لکھنؤ کا گناہ گار چہرہ پیش کیا تھا۔ رشید حسن خاں صاحب آپ کے خط سے متفق ہوتے یا نہ ہوتے دونوں صورتوں میں وہ ایوانِ اُردو ہی کے ذریعے جواب دیتے۔ آپ اپنا خط واپس لے کر کیا رشید حسن خاں صاحب کے متذکرہ مضمون کے تمام مواد سے متفق ہونے کا عندیہ نہیں دے رہے تھے؟ مدیر ایوانِ اُردو نے نیّر مسعود صاحب کا خط چھاپ کر اُردو ادب کے طالب علموں پر احسان کیا ہے جو قد آور شخصیتوں کے رعب میں آ کر ان کی ہر بات کو قولِ فیصل کا درجہ دے دیتے ہیں۔''

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، اکتوبر 1998، صفحہ 57)

☆☆☆

قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، نئی دہلی

''اس وقت میرے پیشِ نظر جولائی اور اگست دونوں مہینوں کے ''ایوانِ اُردو'' کے شمارے ہیں جولائی کے شمارے میں انیس اشفاق اور منظور ہاشمی کی غزلوں نے بہت لطف دیا، نئے مضامین نئے اور دل نشیں پیرائے میں پیش کیے گئے ہیں۔ البتہ محترم نیّر مسعود بھائی کا مضمون بہ نام رشید حسین خاں پڑھ کر قدرے افسوس ہوا۔ لکھنوی معاشرت کے بارے میں لکھنے کے لیے بے شک ان تمام ماخذات کو دیکھنا چاہتے تھے جس کی نیّر بھائی نے نشان دہی فرمائی ہے اور اس لحاظ سے خاں صاحب سے بے شک لغزش ہوئی ہے، اس لیے کہ وہ جس پائے کے محقق ہیں اور انھوں نے کلاسیکی شاہ کاروں کے مطالعے میں جس تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، ان سے بعید ہے کہ وہ کم زور شہادتوں اور SECONDRY FORCES پر تکیہ کر کے اپنی بات کہی۔ البتہ نیّر بھائی جیسے سلیم الطبع اور غیر معمولی علمی صلاحیت رکھنے والے اسکالر سے بھی میں یہ اُمید نہیں کرتا کہ وہ اپنے ایک ہم پیشہ کی کوتاہیوں پر ایسی سرزنش کریں گے جیسا کہ انھوں نے کی ہے۔ اب چوں کہ خود انھیں بھی احساس ہے اور ایوانِ اُردو کے اگلے شمارے میں خط لکھ کر مضمون کی اشاعت پر حیرت اور رنج کا اظہار کیا ہے اس لیے مزید کچھ کہنا سننا عبث ہے۔ تاہم غالباً بہتر یہ ہوتا کہ نیّر بھائی اپنا یہ مضمون سرے سے کسی رسالے کو نہ بھیجتے اور اس درجہ تلخ کلامی کے بجائے ایک مثبت انداز کا مضمون لکھ کر لکھنوی معاشرت کے صحیح خدوخال واضح کر دیتے۔ ہم عصروں کی چپقلش کی یہ کوئی تنہا مثال تو نہیں ہے۔ لیکن جب یہ روایت

دہرائی جاتی ہے تو اسکالرشپ کا قد گھٹ جاتا ہے۔"

(ماہ نامہ ایوانِ اُردو، دہلی، اکتوبر 1998، صفحہ 58)

☆☆☆

Nayyer Masood Ba Naam Rasheed Hasan Khan

Edited by

Dr. Ibraheem Afsar
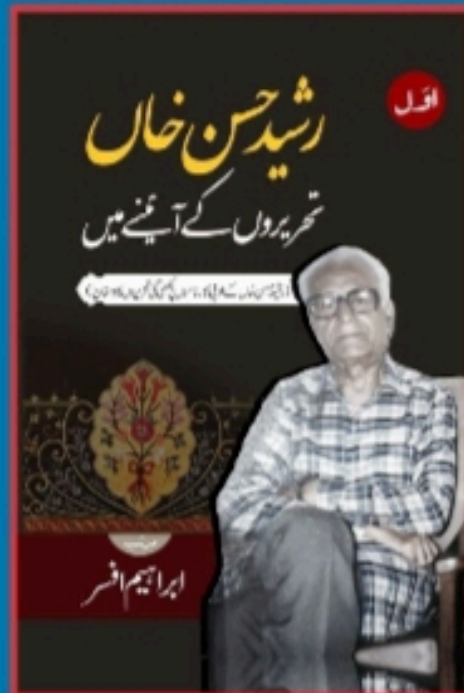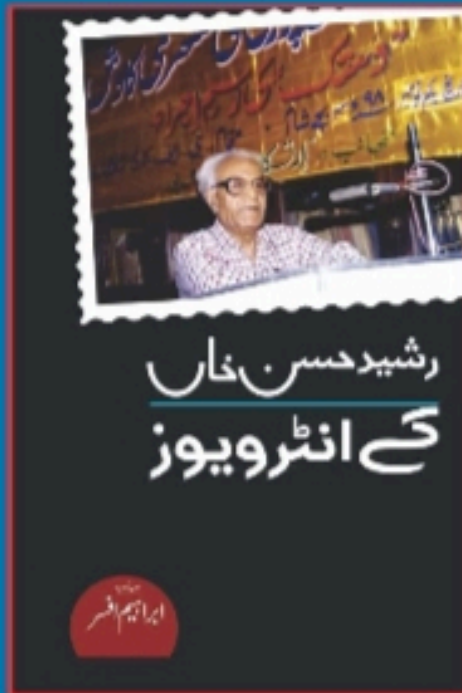
NEW BISMAH KITAB GHAR

Distributor:

Kitabi Duniya

1955, Gali Nawab Mirza, Mohalla Qabristan,
Turkman Gate, Delhi-110006 (INDIA)
Mob:9313972589, 8929421423,
E-mail:kitabduniya@gmail.com
E-mail:kitabduniya@rediffmail.com

ISBN : 978-93-84271-37-4

9 789384 271374